

نام کتاب ـــــــ ایک عورت ہزار دیوانے
مصنف ـــــــ کرشن چندر
کتابت ـــــــ محمد عارف سہسوانی
سن اشاعت ـــــــ ۱۹۹۶ء
مطبوعہ ـــــــ فوٹو آفسیٹ پرنٹرس دہلی
قیمت ـــــــ ۱۵۰ روپے

ISBN 81-86849-07-6

ناشر
ایشیا پبلیشر
اے ۳۶ ۔ چیتک اپارٹمنٹس۔
پلاٹ نمبر ۲/۲۷ ۔ سیکٹر ۹
روہنی نئی دہلی ۸۵

ایک عورت ہزار دیوانے

کرشن چندر



کرشن چندر

پیدائش: ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء ——— وفات: ۸ مارچ ۱۹۷۷ء

Ek Aurat Hazaar Deewane

by

Krishan Chander

Price :- 150/-

Asia Publisher's
A-36, Chetak Apartments
Plot No. 27/2 Sector-9
Rohini, Delhi-110085
Tel :- 7261823
ISBN 81-86849-07-6

میں نے اس ناول کا مواد بھی زندگی سے اکٹھا کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک حسین خانہ بدوش لڑکی لاچی ہے۔ جس کا قبیلہ آج اس بیسویں صدی میں بھی ہزاروں برس پرانی زندگی کی ڈگر پر چل رہا ہے۔ بمبئی کے مضافاتی اسٹیشنوں کے اردگرد اکثر ایسے خانہ بدوش قبیلے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور اپنی عجیب اور دلچسپ زندگی سے کچھ دنوں کے لئے فضا کو رنگین بنا جاتے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسے ہی خانہ بدوش قبیلے اور اس قبیلے کی ایک بہادر لڑکی کی داستان ہے جو ہر قدم پر زندگی کی عظمت کا ثبوت پیش کرتی ہے

کرشن چندر

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء

پہلا باب

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ایک ہنگامہ تھا۔ قلی، کلینر، گاڑی پکڑنے والے مسافر، ٹکٹ چیکر، اسٹیشن کے باہر کھانا بیچنے والا، آدھ وارڈ میں گشت کرنے والے سنتری، جھاڑو پھیرنے والا جمعدار سبھی موجود تھے۔ لاچی کی طرف دیکھ کے ہنس رہے تھے۔ اور لاچی سب سے الگ تھلگ اسٹیشن ماسٹر کی میز کے سامنے اپنے دونوں کولھوں پہ بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے اپنے دونوں ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ اور اس کے چہرے پر ایسا غصہ تھا جیسے ابھی سب کو کچا کھا جائے گی۔ مگر اس وقت وہ دشمنوں کے نرغے میں بے بس کھڑی تھی۔ اور اسٹیشن کے لوگ جو اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کے ہنس رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہہ رہے تھے۔

پارٹر سنتری جب لاچی کو لئے پہلے پہل اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے لاچی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ مگر اسٹیشن ماسٹر کے سامنے آتے ہی لاچی نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کولھوں پہ رکھ کے بڑی بے غیرتی سے کھڑی ہوگئی۔ رنگ لال اسٹیشن ماسٹر کو کسی طرح کا ہنگامہ قطعی پسند نہ تھا وہ بیوی بچوں والا امن پسند گجراتی تھا۔ ۲۲ سال اسے ریلوے کی سروس کرتے ہو گئے تھے۔ اس کا بڑا لڑکا ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہونے والا تھا۔

اس کی چھوٹی لڑکی دلاب کالج میں پڑھتی تھی جس کے لیئے بر ڈھونڈنے میں اسے بڑی پریشانی ہو رہی تھی پھر دن بھر اسٹیشن چلانے اور خوش اسلوبی سے چلانے کی ذمہ داری تھی ۔ اور ابھی وہ گنگا دین بھیا گمانس والے سے اسٹیشن ویگنوں کا معاملہ طے کر رہا تھا ۔ جس سے اسے پانچ سو روپے کے قریب ملنے کی اُمید تھی کہ بیچ میں یہ ہنگامہ ٹپک پڑا ۔ رسک لال نے اپنے پتلے دُبلے چہرے کی تھوڑی ٹھنڈ کو کھجاتے ہوئے بھرے بھرے بدن والی لاچی کو دیکھا پھر بارڈ سنتری کو دیکھا ۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے ۔ وہ تلخ لہجے میں بولا ۔

کیا ہے ۔

بارڈ سنتری نے لاچی کو ہاتھ لگا کر کہا ۔

اس نے بارڈ سے کوئلہ چرایا ہے ۔

لاچی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹک کر کہا ۔

مجھے ہاتھ مت لگا ۔ دور سے بات کر

مجمع میں ہنسی اور مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ مادھو بھیل والا خوشی سے چیخ کے بولا ۔

ابے کاٹ کھائے گی سنتری ! بھیڑوں کی رانی ہے یہ ۔

تو چپ رہ چکے پیٹنے ۔

لاچی مادھو کی طرف دیکھ کر بولی ۔

مادھو بھیل والا میانے قد کا گدرائے بدن کا تھا ۔ وہ اپنی کمر پہ صرف ایک میلی کچیلی جھول سی دھوتی باندھے رکھتا تھا جو مشکل اس کے گھٹنوں تک آتی تھی ۔ دھڑ کے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے وہ بالکل ننگا رہتا تھا ۔ اس کا رنگ سانولا تھا ، اس کے جسم پر کہیں ایک بال نظر نہ آتا ۔ اور اس کے سانولے رنگ میں ایک ایسی سبزی مائل چمک تھی کہ جب لاچی نے اسے کچا پپیتا کہا تو یہ پھبتی اس پر بالکل چپک کر رہ گئی ۔

اور مجمع پھر بے اختیار ہنسنے لگا ۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی ۔ اس لیئے اسٹیشن ماسٹر نے جلدی جلدی لاچی سے پوچھا ۔

تو نے پپیتا چرایا ہے۔

پپیتا نہیں کوئلہ چرایا ہے۔

لاچی بے اختیار ہنس کر بولی۔ اور اسٹیشن ماسٹر کی طرف اُنگلی اُٹھا کر مجمع کی طرف داد طلب نگاہوں سے جیسے کہنے لگی۔ دیکھ لو، ایک احمق یہ بھی ہے۔

رسک لال نے گھبرا کر کوئلے کی جگہ پپیتا کہہ تو دیا۔ مگر اب مجمع کو ہنستا دیکھ کر خود اُس کی ہنسی بھی نہ رک سکی۔ غصے میں بھرا ہوا یارڈ سنتری بھی ہنس پڑا۔ رسک لال نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر نظریں جھکاتے ہوئے بناوٹی سنجیدگی سے کہا۔ جانے دو یارڈ سنتری! اس وقت تین ڈاؤن کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اور تم یہ جھگڑا لے آئے۔ پھر رسک لال نے گھبرا کر لاچی کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ جاؤ۔ لیکن پھر کبھی اسٹیشن یارڈ سے کوئلہ نہ چُرانا ورنہ جیل میں بھیج دوں گا۔

"اچھا"

لاچی نے اسٹیشن ماسٹر کی میز سے مُڑتے ہوئے اس طرح کہا جیسے وہ اسٹیشن ماسٹر پر نہیں، سارے مجمع پر احسان کر رہی ہو۔ اور نیل چھینٹ والے پھولدار گھاگرے کو جھلاتی ہوئی ننگے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکل کر وہ نمبر ایک پلیٹ فارم پہ آ گئی۔ اور تیز تیز قدموں سے باہر کے گیٹ کی طرف جانے لگی۔ لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کیونکہ لوگ اکثر اسی طرح دیکھتے تھے۔ مرد حسرت سے دیکھتے تھے عورتیں رشک سے۔ وہ خانہ بدوشوں کی لڑکی تھی۔ جانے کتنی نسلوں، قوموں، رنگوں کے باہم امتزاج کے بعد حسن کا یہ نادر نمونہ تیار ہوا تھا۔ اونچا پورا قد، سنہرا گندمی رنگ، گہری سبز آنکھیں، سینے میں کمان کا سا خم۔ اور تنا ہوا۔ اور کمر میں تیر کی سی لچک انداز کے لئے جب لاچی چلتی تھی۔ تو اس کامل اعتماد سے جیسے ساری دُنیا اسے جھک کر سلام کر رہی ہو۔

ایسی عورتوں کو واقعی جیل بھیج دینا چاہئے حمید ے ٹیکسی ڈرائیور نے لاچی کو گیٹ کے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

حمیدا ٹیکسی ڈرائیوروں کا سرغنہ تھا۔ اور اسٹیشن کے آس پاس کے علاقے کا دادا سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقہ میں شراب۔ چرس۔ افیون اور لڑکیوں کا دھندا اسی کی معرفت ہوا کرتا تھا۔ وہ کالا ناٹا۔ گٹھے ہوئے بدن کا انتہائی پھرتیلا نوجوان تھا۔ اور اپنے نزدیک بہت کچھ تھا۔ اور جو لوگ اسے بہت کچھ نہیں سمجھتا تھا وہ اسے ٹھیک کر دیتا تھا۔ خود ریلوے لال اسٹیشن ماسٹر اس سے ڈرتا تھا۔ اور ہمیشہ طرح دیتا تھا۔

مگر لاچی حمیدے سے بالکل نہیں ڈرتی تھی۔ اس نے جب حمیدے کا یہ فقرہ سنا تو اس نے جواب میں زور سے حمیدے کی طرف تھوک دیا اور کمر کو جھلاتی ہوئی اور پیٹھ کھجاتی ہوئی اپنی کالی چولی کی بانہیں ٹھیک کرتی ہوئی آگے کے بس اسٹینڈ کی طرف بھیک مانگنے کے لئے بڑھ گئی کیونکہ اس وقت پوری دلی لوکل پلیٹ فارم نمبر دو پہ آچکی تھی۔ اور لوگ گیٹ سے بھاگتے ہوئے بس اسٹینڈ پر کیو لگانے کے لئے کھڑے ہو رہے تھے۔

حمیدے کو لاچی کے تھوکنے پر ذرا غصہ نہ آیا۔ دو تین بار اس نے ڈرا دھمکا کے لاچی کو اپنے رعب میں لانا چاہا تھا۔ مگر ہر بار منہ کی کھانی پڑی تھی۔ اسے جلدی معلوم ہو گیا کہ لاچی کا بدن بے حد مضبوط ہے اسے خانہ بدوشوں اور نٹنیوں کے کئی گر ایسے یاد ہیں۔ جن کی مدد سے کسی مرد کو پٹخنی دے سکتی ہے۔

لاچی عام شہری یا دیہاتی عورتوں کی طرح نہیں تھی۔ جو مرد کا ایک گھونسہ کھاتے ہی چٹائی کی طرح بچھ جاتی ہیں۔ حمیدا لاچی کو چھیڑنے کا عملی تجربہ کر چکا تھا۔ اس لئے اب تھوکنے پر بھی کھسیا کے ہنس دیا تھا۔ اور منہ پھیر کر اپنی ٹیکسی کی طرف چلا گیا۔

لاچی نے چلتے چلتے مادھو کی دکان سے ایک امرود اٹھا لیا اور اپنے بے حد سفید اور متناسب دانت اس میں گاڑ دیئے۔ اور اسے ایک گلہری کی طرح کھانے لگی۔ وہ امرود کھاتی

جاتی تھی اور شریر نگاہوں سے مادھو کی طرف دیکھتی جاتی تھی۔ جو بالکل مبہوت ہو کر لاچی کے چہرے کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے لوہا مقناطیس کو دیکھتا۔ اگر وہ دیکھ سکتا یہ کہنا مشکل ہے کہ مادھو اس وقت کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کیسی گرسنا بے بسی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے گیلے ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا کئے۔

امرودوں کا پورا ٹوکرا لے جاؤ۔

لاچی نے آدھا کھایا ہوا امرود اس کے منہ پر دے مارا۔ اور آگے بڑھ گئی جب وہ مادھو کی دکان کے پیچھے سے باہر گئی اس وقت ڈوبتے سورج نے اس کے بکھرے بکھرے گھنیرے سرخ بالوں کو چھو لیا۔ اور لاچی کے سر کے گرد شعلوں کا ایک لپکتا ہوا تڑپتا ہوا ہالہ سا بن گیا۔ اور غریب مادھو نے اسے دیکھ کر بے اختیار کہا۔

معلوم ہوتا ہے بیری کے جھاڑ کو آگ لگی ہے۔

پھر وہ چپکے سے لاچی کا جھوٹا امرود کھانے لگا۔ اور لاچی کو دکھا دکھا کے کھانے لگا۔

تیرا جھوٹا کھا رہا ہوں لاچی۔

لاچی نے چلتے چلتے مڑ کر وار کیا۔

میرا کھوتا کھا ہوا۔

اب لاچی بس اسٹینڈ کے کیبو تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنا شروع کر دیا۔

عینک والے بابو ایک آنہ

چھاتے والی بی بی ایک آنہ

بنڈل والے سرکار جی ایک آنہ

جیسے وہ بھیک نہ مانگ رہی ہو۔ کیبو میں کھڑے ہوئے لوگوں کو نیلام کر رہی ہو۔ سارا مال لٹا دیا ایک آنے میں۔

ایک بابو نے اس کی جانب آنکھ مار کے کہا۔

بارہ آنے دوں گا۔

اپنی ماں کو دے۔

تڑاخ سے لاچی نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

اس دنیا میں بڑی مشکل ہے۔ لیکن خانہ بدوشوں کے لئے تو یہاں اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ کھیتوں میں اگے ہوئے پودوں کی طرح جو لوگ ایک ہی شہر یا گاؤں میں رہتے ہیں وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں۔

خوشی کی ہوا میں ایک ساتھ لہلہا کر سرسرانے میں گیت گاتے ہیں اور اونچے ہو جاتے ہیں۔ بھوک کے پالے میں ایک ساتھ ٹھٹھرتے ہیں۔ اور بیماری کی وبا میں ایک ساتھ گر کر کٹ جاتے ہیں۔ لیکن خانہ بدوشوں کے لئے ہر جگہ مشکل ہے۔ وہ ہر کھیت کے کنارے اجنبی ہیں۔ اور ہر گاؤں کی حد میں انجانے۔ شہر کی گلی کا ہر موڑ ان کے لئے ایک نیا خطرہ ہے اور ہر چوراہے کا سنتری ہر وقت جب دخل کر سکتا ہے وہ ہر جگہ اکیلے ہیں۔ یہ لوگ جو کسی قوم، کسی مذہب، کسی رنگ اور کسی ملک کے نہیں ہیں۔ یا شاید یہ سب کے ہیں اس لئے یہ کسی کے نہیں ہیں۔ ان کے رنگ میں سب کا رنگ ہے ان کے خون میں سب کا خون ہے۔ اور ان کی زبان میں سب سب کی زبانیں ہیں۔ یہ لوگ جو اپنا خیمہ، اپنی چٹائی، گھاس کے چند تنکے لئے گھومتے ہیں، کس آشیانے کی تلاش میں ہیں۔ اپنی کاوش کا انجام انھیں خود معلوم نہیں۔

لاچی اپنے قبیلے میں اپنے چاچا مامن کے پاس رہتی تھیں۔ کیوں کہ چاچا مامن کے پاس اس کی ماں رہتی تھی۔ اور اس کی ماں چاچا مامن کے پاس اس لئے رہتی تھی کیوں کہ اس کا شوہر مرگیا ایک بار شراب پی کر اسے جوئے میں ہار گیا تھا۔ ان دنوں لاچی صرف چار سال کی تھی۔ اس لئے جب ماں کے ساتھ بیٹی بھی آگئی تو مامن بہت خوش ہوا۔ کیوں کہ خانہ بدوشوں کے قبیلے میں عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ کماتی ہیں۔ مرد دن میں چار آنے کی ٹوکری تیار کرتے ہیں یا

تین دن میں تو آنے کی چٹائی بُن لیتے ہیں۔ لیکن عورتیں آرٹ سلک کے گھیر بے دار گھاگرے پہنے، ریشم کی چولی چمکائے آنکھوں میں سُرمہ ہونٹوں پر مُسکراہٹ نگاہوں میں دعوت نظارہ لئے گلی کوچوں کے موڑ پر بیٹھتی ہیں اور عینکیں بیچتی ہیں جڑی بوٹیاں بیچتی ہیں۔ گلٹ کی انگوٹھیاں۔ جھمکے آویزے نگینے، سورج کے ہار بیچتی ہیں اور خوب کماتی ہیں۔ ورنہ یہ خوبصورت کپڑے یہ اونچی ایڑی کے جوتے یہ کھائے پیئے شاداب جسم کہاں سے آتے ہیں۔ کسی فیکٹری سے ڈھل کر تو آتے نہیں۔ اس کے علاوہ خانہ بدوشوں کی بہت جوان عورتیں پرانا دھندہ بھی کرتی تھیں۔ لاچی اپنے قبیلے میں روشنی بامان بستی۔ مینہاں یہی کرتی تھیں۔ شام ہوتے اسٹیشن یارڈ کے مغرب کنارے پر جہاں خانہ بدوشوں کے خیمے تھے۔ وہاں پر کئی موٹریں آکر کھڑی ہو جاتی تھیں کیونکہ شہر میں اپنی اچھی اور مقابلتاً سستی چیزیں کہاں سے مل سکیں گی۔ اور ہر بیوپاری وہی مال خریدنا چاہتا ہے جو اچھا ہو اور نسبتاً سستا ہو۔ تم لوگ امیر آدمی کی رات کو کیا سمجھتے ہو۔ دن بھر کے کتنے دھوکوں جھوٹے وعدوں چھینا جھپٹیوں اور اہلِ غریبوں کے بعد۔ صبح سے شام تک ضمیر کا خون کرنے کے بعد تو رات آتی ہے۔ اس رات میں وسکی کی نئی بوتل نہ ملے تو لعنت ہے اس کار کرنے پر۔ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لئے ہر آدمی کام کرتا ہے۔

اس لئے جب رات آتی ہے تو ہر خانہ بدوش قبیلے کے ڈیرے پر تہذیب ٹہکتی ہوئی کاروں سے کر آتی ہے۔ اور کھلی ہوا میں پلے ہوئے شاداب جنگلی پھولوں کو چُن کر لے جاتی ہے۔ بیسویں صدی پہلی صدی سے ملتی ہے اور اس تہذیب کے ارتقاء میں اس نے جو کھویا ہے اسے پانے کی سعی کرتی ہے۔ اور جو پایا ہے اسے کھونے کی سرشاری میں رات گزار دیتی ہے۔

اور جب رات گزر جاتی ہے تو کاریں اپنے آفس چلی جاتی ہیں اور غریب خانہ بدوش لڑکیاں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر عینکیں بیچتی ہیں۔ ہے کوئی جو عینک لگا کر دیکھے!

دوسرا باب

شام ڈھل کر رات میں گم ہو رہی تھی۔ جب لاچی اپنے خیمے میں واپس آئی۔ خانہ بدوشوں کے خیمے اسٹیشن یارڈ کے مغربی جانب تھے۔ یہاں گھاس کا ٹیڑھا میڑھا بیچ بیچ پتھروں سے اٹا ہوا ایک کشادہ قطعہ تھا۔ جس کے شمال میں گل مہر کے پیڑوں کی ایک قطار چلی گئی تھی۔ مغربی کنارے پر میں پتھر کے کوئلے کا ایک شیڈ تھا۔ اور بہت سا کوئلہ ترپال سے ڈھکا ہوا شیڈ سے باہر پڑا تھا۔ جنوب میں گنگادین بھیا گھاس والے کی گھاس کے سینکڑوں گٹھے ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے۔ مشرقی جانب ایک پرانا تالاب تھا۔ جس کے پرے وکٹر کانٹے والے کا کوارٹر تھا۔

گل مہر کے پیڑوں کی قطاروں سے پرے موٹر روڈ تھی۔ جو ہوائی اڈے کو جاتی تھی۔ ہوائی اڈے سے پرے شمالی پہاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔ جن کی چوٹیوں پہ ہوائی جہاز کو خبردار کرنے کے لئے رات میں لال لال روشنیاں جگمگاتی تھیں۔

لاچی جب ریلوے کے یارڈ کا جنگلا الانگھ کر جوہڑ کے کنارے چلتی ہوئی ایک ٹیلے کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا، اس کا باپ رگی ٹیلے پہ بیٹھا پتھروں سے کھیل رہا ہے۔ رگی کی پیٹھ لاچی کی طرف تھی لیکن لاچی کو معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اسے دیکھ لیا ہے۔ وہ اس کے قریب سے ہو کر جانے لگی تو رگی نے خاموشی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ایک عرصے سے رگی

کا یہ دستور تھا کہ وہ شام ڈھلے ٹیلے پر پہنچ جاتا۔ اور اپنی بیٹی کا انتظار کرتا۔ اور جب لاچی اس کے سامنے سے ہو کر جانے لگتی تو دست سوال آگے بڑھا دیتا۔

لاچی نے جیب ٹٹولی اور اس میں سے چار آنے نکال کے رگی کے ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ باپ بیٹی میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ جس دن سے رگی اپنی بیوی اور بیٹی کو جوئے میں ہار گیا تھا۔ اس دن سے بیٹی کو بھی اس سے نفرت ہو گئی تھی۔ رگی بے حد نکما اور کاہل تھا۔ یوں وہ دف بجانے۔ ناچنے۔ گانے اور شراب پینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہے۔ اس کی آواز بڑی پاٹ دار اور سُریلی تھی۔ اور وہ ٹوکریاں بھی بہت اچھی بناتا تھا۔ لیکن کام کرنے سے جیسے اُسے نفرت تھی۔ خانہ بدوشوں میں اس کے کپڑے سب سے زیادہ میلے کچیلے اور پھٹے پُرانے ہوتے تھے۔ ان میلے چیکٹ کپڑوں میں اس کی بڑھی ہوئی داڑھی کے اُوپر تانبا رنگ رخسار ہر وقت ایک عجیب شرارت سے چمکتے تھے۔ چونی لے کر اس نے اپنی پُرانی واسکٹ میں ڈال لی۔ اور پھر پتھروں سے کھیلنے لگا۔ کئی بار لاچی کا جی چاہا کہ اپنے باپ کو ریزگاری دینے کی بجائے اس کے شرارت بھرے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کر دے لیکن ہر بار جانے کون سا جذبہ تھا جو اس کے ہاتھ روک لیتا تھا اور وہ مجبور ہو جاتی تھی کہ اپنے باپ کے کالے گھنے بالوں والے ہاتھ کی ہتھیلی پر چار آنے رکھ دے ہاں آگے بڑھ کر اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے وہ ہمیشہ یہی سوچتی تھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے وہ اس کو تھپڑ کیوں نہیں مار سکتی۔

اس دنیا میں ہر جذبہ اپنا تاوان کیوں وصول کر لیتا ہے۔ اس نے ایک چھوٹے سے پتھر کو اپنے ننگے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔ اور لڑھکتے ہوئے پتھر کے پیچ بھاگتے بھاگتے وہ اپنے خیمے تک پہنچ گئی۔ خیمے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ خیمے کے باہر ایک چٹائی بچھا کر اس کا چچا مامن اور قبیلے کا سردار درمان مٹی کے پیالے میں ٹھرا پی رہے تھے اور تاش کھیل رہے تھے۔ لاچی کی ماں مامن کے کندھے سے لگی ناش

کے پتوں کو دیکھتی ہوئی اپنے خاوند کو مشورہ دیتی جاتی تھی ۔ اور کبھی کبھی مامن کا پیالہ اٹھا کر اس میں سے ایک گھونٹ پی لیتی تھی ۔ لیکن خاوند بیوی دونوں کی کوشش کے باوجود مامن ہار رہا تھا اور سیاہ رنگ ابھوتری ناک والے دارو سردار کے چہرے پر فتحمندی کی ابلیسانہ چمک تھی !

لاچی کے پاؤں کی آہٹ سن کر تینوں نے مڑ کر لاچی کی طرف دیکھا ۔ دارو کے چہرے پر ایک عجیب حریصانہ چمک نمودار ہوئی ۔ مامن کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور مامن کی بیوی نے ایک کھوکھلی ہنسی ہنس کر اپنی جھولی لاچی کی طرف پھیلا دی ۔ لاچی نے اپنی جیب سے ساری ریزگاری نکال کے اپنی ماں کی جھولی میں ڈال دی اور ٹھکتی ہوئی خیمے کے اندر چلی گئی ۔

" مجھے دیدے کوئی "

مامن نے ہاتھ آگے بڑھا کے اپنی بیوی سے کہا ۔

ٹھہر تو کمبخت گن لینے دے ۔ وہ گنتے گنتے بولی ۔

گن کے کیا کرے گی ۔ مامن نفرت سے بولا ۔ ہوں گے پندرہ بیس آنہ ۔ جن میں سے چار چھ آنے وہ تجھ سے پہلے خصم کو دے آئی ہوگی ۔

اور تم جو یہ جُوا کھیل رہے ہو ۔ یہ شراب پی رہے ہو ۔ یہ مچھلی کھا رہے ہو ۔ یہ کس کی محنت کی کمائی ہے ۔ یکایک کوئی غصے سے اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی ۔

مامن کی بیوی نے بالکل ٹھیک طعنہ دیا تھا ۔ وہ ادھیڑ ہوگئی تھی پھر بھی اتنی خوبصورت تھی کہ اگر دل لگا کر شکار کرتی تو آٹھ دس روپے اینٹھنا اس کے لئے مشکل نہ تھا لیکن اب اس کا جی نہ چاہتا تھا ۔ جب گھر میں جوان بیٹی موجود ہو تو کس ماں کا جی خود دھندہ کرنے کو چاہے گا ۔ سوچنے کی بات ہے کس انسان کا دل آرام کرنے کو نہیں چاہتا ۔

لیکن آج مامن کا جی پینے اور جُوا کھیلنے کو چاہ رہا تھا ۔ اور اس نے لاچی کی ماں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ آج اس کے لئے کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر دے ۔ اور یہ تو دونوں کو معلوم تھا کہ لاچی مرتے مرتے مر جائے گی لیکن یہ بندوبست نہ کرے گی ۔ اس لئے بیچاری

غریب ماں ہی کو کچھ کرنا پڑتا۔ اس لئے ٹھرا پیتے پیتے لاچی کی ماں کو بھی ایسا محسوس ہوا تھا جیسے زہر کا گھونٹ پی رہی ہو۔ اسے لاچی پر بے حد غصہ آتا تھا۔ لیکن مامن کی بات بھی برداشت نہ کر سکی تھی۔

مامن یہ سن کر چپ تو ہو گیا۔ لیکن اس کے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس آگ پر تیل چھڑکتے ہوئے دمارد نے کہا۔

جوان عورت سونے کی کان ہوتی ہے۔ اور پھر لاچی ایسی خوب صورت لڑکی!

لاچی نے فوراً کہا۔

تم مجھے کوئلوں کی کان سمجھ لو یا پتھر کی کان۔ لیکن میں دھندہ نہیں کروں گی۔

تم بیچ میں مت بولو۔ مامن کی بیوی نے لاچی سے سختی سے کہا۔ جاؤ مچھلیاں تل کے لاؤ۔

لاچی خیمے کے ایک طرف مچھلیاں تلنے لگی۔ آگ کے شعلوں کی روشنی میں وہ اور بھی خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ دمارد سردار نظر بچا کر بار بار اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔

آج دمارد سردار بہت خوش تھا۔ وہ برابر جیت رہا تھا۔

بہت رات گئے جب ٹھرا ختم ہو گیا۔ اور لاچی کی آنکھوں میں نیند آنے لگی اور دیئے کی لو بجھنے لگی تو ان لوگوں نے بازی اٹھا دی۔ مامن کی بیوی نے جب حساب کیا تو مامن پچاس روپے ہار چکا تھا۔ مامن نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اس میں صرف دس آنے کے پیسے نکلے۔

دس آنے کم پچاس۔ دمارد نے سختی سے کہا اور ہاتھ پھیلا دیئے لاؤ۔

مامن کی بیوی اٹھ کے خیمے کے اندر چلی گئی۔ اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں تین روپے تھے۔ تین روپے دس آنے کم پچاس۔

دمارد پھر چلایا۔

میرا دف لے لو۔ چھا نجھ لے لو۔ مامن کی بیوی بولی۔ دمارد

دمارد حقارت سے ہنسا۔

میرا خنجر لے لو۔ جس پہ چاندی کی مٹھی ہے۔

دمارد شرارت سے ہنسا۔ بولا۔

میں تو سونے کے بالوں والی لاچی لوں گا۔

صرف پچاس روپے ہیں۔ ناممکن۔ مامن نے سر ہلا کے کہا۔

دمارد نے جیب سے پچاس روپے اور نکالے اور بولا۔

وہ پچاس روپے تمہیں معاف کئے۔ پچاس اور دیئے۔ اب بولو؟

سو روپے بہت ہوتے ہیں۔ مامن سوچی میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مامن نے دمارد کو دیکھ کر انکار میں سر ہلا دیا۔

ایک سو پچاس!

دمارد نے پچاس اور بڑھا دیئے۔

دو سو روپے اب مامن کے پاس پڑے تھے۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں بے تاب ہونے لگیں۔ اس نے بہت بے چینی اور مضطرب نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف اس طرح دیکھا۔ لیکن اس کی بیوی نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔

ڈھائی سو۔ دمارد غصے میں چلایا۔

آج تو میں لاچی کو لے کر ہی جاؤں گا۔

ڈھائی سو کی رقم دیکھ کر مامن سے نہ رہا گیا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا ہی دیا۔ لیکن اس کی بیوی نے پھر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

دمارد نے جیب ٹٹول کر سو کا آخری نوٹ نکالا۔ سو کا ہرا نوٹ دیکھ کر مامن اور اس کی بیوی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

دمارد اس کے قبیلے کا سردار تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا آتنا امیر ہے وہ تو بظاہر بالکل انھیں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

مامن کی بیوی نے ہتھیار ڈال دیے۔

مامن نے ساڑھے تین سو کے نوٹ اٹھا کے اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔
اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا۔
ٹھہرو ——— ؟
گھوم کے دیکھا تو لاچی کا باپ رگی کھڑا تھا۔ اس کے تانبا رنگ رخساروں پر ایک معنی خیز شرارت جھلک رہی تھی۔
اپنی طرف سب کو متوجہ دیکھ کر بولا۔
سودا تو اچھا ہے کوئی۔ رگی نے طنز آمیز نگاہوں سے اپنی پہلی بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔
باپ اپنی بیوی کو ستر روپے میں ہار گیا بیوی نے اپنی بیٹی کے ساڑھے تین سو روپے وصول کر لیے۔
پھر ———
مامن کی بیوی زور سے چلائی۔
اس کی آواز میں ایک خطرناک چیلنج تھا۔
رگی نے بڑی نرمی سے کہا۔
میں لاچی کا باپ ہوں۔ ٹھیک ہے میں نے اس کی پرورش نہیں کی۔ مگر اس کی رگوں میں خون تو میرا ہے۔
کون کہہ سکتا ہے۔
مامن کی بیوی زور سے ہنسی۔
رگی نے سُنی اَن سُنی کر کے کہا۔

مجھے میرا حصہ ملنا چاہیئے۔

بیس روپے تو بھی لے۔

دمارو نے اپنی جیب سے بیس روپے دیتے ہوئے کہا۔ وہ لاچی کے معاملے میں کسی طرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ رگی نے بیس روپے اپنی جیب میں ٹھا لتے ہوئے دمارو کی طرف شک کی نظروں سے دیکھا۔ بولا۔

اتنے روپے تو خانہ بدوشوں کی ملکہ کے پاس نہ ہوں گے تمہیں کہاں سے ملے۔ جعلی نہیں ہیں۔ دمارو نے جواب میں بڑی نخوت سے کہا۔ جیسے جی چاہے دکھا کے تسلی کرے۔ زیادہ پوچھنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔

نہیں سردار۔

رگی نے یکایک بڑی حلیمی سے کہا۔

تو سودا پکا۔

دمارو نے ایک بار پھر سب سے پُوچھا۔

سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایک کے بعد دونوں خانہ بدوش ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے۔ دمارو نے مامن کی بیوی کا ہاتھ چوم کر کہا۔

یاد ہے میں تجھ پر عاشق تھا لیکن تیرے باپ نے تجھے میرے ہاتھ نہیں دیا۔ رگی کو دے دیا۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد دمارو نے مامن کی بیوی سے آہستہ پُوچھا۔

لاچی کہاں ہے۔

خیمے میں سو رہی ہے۔

دمارو کے لئے اب سب سے مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اب

اسے خیمے میں گھس کر لاچی کو اپنی بانہوں میں اُٹھا کر اپنے خیمے تک لے جانا تھا۔ لاچی کوئی نازک دُبلی پتلی راجکماری نہ تھی۔ اچھی خاصی مضبوط ہٹی کٹی بھرے بدن کی لڑکی تھی۔ اور وہ اب بُڈھا ہو چکا تھا۔

اسے آواز دے کر جگا دو۔ یا اسے جگا کر باہر لے آؤ۔ اور اسے سب باتیں بتا دو۔

دمارو کمزور آواز میں بولا۔

رگی نے شریر لہجے میں کہا۔

یہ غلط بات ہے۔ رسم پوری کرنی ہو گی۔ خیمے کے اندر گھس کر لڑکی کو جگاؤ۔ وہ مزاحمت کرے تو اس کا مقابلہ کرو۔ اسے اپنی بانہوں میں اُٹھا کر اپنے خیمے تک لے جاؤ گے تو لاچی تمھاری ہے ورنہ۔

لیکن مامن نے رگی کی شرارت تاڑ لی۔ مامن کسی طرح کا جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ لاچی دھندہ تو کرتی نہیں تھی۔ جتنا کماتی تھی اپنے آپ پر خرچ کرتی تھی۔ ایسی گھوڑی سے کیا فائدہ جو پیٹھ پر ہاتھ نہ رکھنے دے لیکن گھاس کھاتی چلی جائے۔ ایسی خوب صورتی کو کیا چاٹنا ہے کیا اچھا ہوا اس نے لونڈیا کے ساڑھے تین سو وصول کر لئے۔ ورنہ وہ تو یہاں سے بھی جاتی تو سودا ایسا نہ ہوتا۔ اس لئے مامن نے دمارو کو تسلی دے کر کہا۔

میں تمھارے ساتھ خیمے کے اندر چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کیسے وہ سور کی بچی ——

مامن اور دمارو دونوں ایک ساتھ خیمے کی طرف بڑھے۔ اور دوسرے لمحے میں ایک ساتھ ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

خیمے کی جھولتی ہوئی سرکو اوپر اُٹھا کر لاچی باہر آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کی مٹھی والا خنجر تھا۔ اور اس کی گہری سبز آنکھیں سمندر کی طرح غضب آلود تھیں!

تیسرا باب

کس نے بیچا ہے مجھے؟

لاچی نے ہاتھ میں خنجر اٹھا کے پوچھا۔

رگی، مامن، دمارو تینوں چپ رہے۔ رگی نے اپنے پاؤں ادھر اُدھر کیے۔ مامن نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ دمارو البتہ بالکل مبہوت ہو کر لاچی کی طرف دیکھتا رہا۔

لیکن تینوں میں سے کوئی نہ بولا۔

لاچی کی ماں بولی۔

عورت، گھوڑی اور زمین ہمیشہ بکتی ہے۔ تجھے سردار نے خرید لیا ہے۔

لاچی میں نے تیرے لئے ساڑھے تین سو روپے دیئے ہیں۔ دمارو ایک قدم آگے بڑھا کر لاچی سے بولا۔

خبردار جو میری طرف آگے بڑھا۔

لاچی نے وہیں سے خنجر ہوا میں لہرایا۔

دمارو پیچھے ہٹ گیا۔

لاچی نے ماں سے کہا۔ ماں! سردار کے پیسے لوٹا دے۔

ماں زور سے ہنسی۔ اس کی طنز آمیز ہنسی کا خفتہ انکار تیر کی طرح لاچی کے سینے

میں اُتر گیا۔ لاچی دو قدم آگے بڑھ آئی۔ پھر دو قدم اور بڑھی۔ پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتے بڑھتے دمارد کے بالکل قریب چلی گئی۔ خنجر اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ دمارد کے قریب جا کر خنجر کو بالکل اس کے چہرے کے سامنے کھڑا کر کے بولی۔ اگر ہمت ہے تو مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔ کیوں کہ مجھے تیرا یہ لمبی ناک والا شتر مرغ کا چہرہ پسند نہیں ہے۔

دمارد غصے میں پلٹا اور پلٹ کر بجلی کی طرح اس نے لاچی کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔ اور اپنے خیمے کی طرف لے چلا۔ لاچی اس کے بازوؤں میں تڑپی۔ اس کا خنجر ہوا میں لہرایا۔ اور قریب تھا کہ دمارد سردار کے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ لیکن دمارد نے اسی وقت اپنے دونوں بازو چھوڑ دیئے اور لاچی دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ اور خنجر مٹھی تک زمین میں گھس گیا۔ مامن نے بھاگ کر خنجر کو زمین سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب لاچی خنجر لینے کے لیے بڑھی تو مامن نے زور کا ایک ہاتھ دیا۔ جو لاچی کی گردن پر لگا اور لاچی دمارد پر جا گری۔ جس نے اسے پھر اپنے بازوؤں میں باندھ لیا۔ لیکن لاچی داؤ لگا کر ایک مچھلی کی طرح اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکل گئی۔ دمارد نے پھر اسے پکڑ لیا اور دو گھونسے مار کر زمین پر گرا دیا۔ اور پھر غصے میں اس کے بال پکڑ کر اسے زمین پر گھسیٹنے لگا۔ لاچی نے اس کی کلائی پکڑ لی اور زور لگا کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ تو دمارد دُہرا ہو کر لاچی پر جا گرا۔ لاچی لچک کر بل کھا الگ ہو گئی اور جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر بولی۔

آؤ میرے سردار مجھے اُٹھا کے لے جاؤ۔

دمارد کی کنپٹی پر ضرب آ گئی تھی۔ اور اس کی سانس بھی پھول گئی تھی۔ لیکن وہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ پھر آگے بڑھا۔ عجیب بات ہوئی کہ اب کے لاچی نے بالکل کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دمارد نے اسے پھول کی طرح اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔ اور اپنے خیمے کی طرف چلا۔ ابھی دو قدم ہی گیا تھا کہ لاچی بغیر کسی مزاحمت کے اس کے بازوؤں میں یوں نکل گئی جیسے پانی چھلنی سے بہہ جاتا ہے۔ اب لاچی پھر زمین پر گری اور بالکل بے بس نگاہوں سے دمارد کو دیکھ

رہی تھی ۔ دمارد نے پھر ہمت کر کے اسے اپنی بانہوں میں اُٹھا لیا ۔ اور اپنے خیمے کی طرف جانے لگا ۔ اب کے وہ آدھا راستہ طے کر گیا ۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد لاچی پھر لپک کر اس کے بازوؤں میں سے پھسل گئی ۔ اور اپنے خیمے کو بھاگ گئی ۔ دمارد اس کے پیچھے دوڑا خیمے کے قریب اس نے لاچی کو پھر جا پکڑا ۔ لیکن لاچی نے جھک کر اس کی ٹانگوں میں گھس کر اسے جو پٹخنی دی تو دوسرے لمحے میں دمارد کا سر زمین پر تھا ۔ اور ٹانگیں ہوا میں معلق ! دمارد کپڑے جھاڑتا ہوا اُٹھا اور ایک پاگل ہانپتے ہوئے بوڑھے کی طرح چیختا چلاتا ہوا لاچی پر حملہ آور ہوا ۔ اور لاچی اسے پھر پٹخنی پھر پٹخنی دی ۔ اب دمارد کا دم اکھڑ چکا تھا ۔ آخری پٹخنی کھا کر اس سے زمین سے اُٹھا بھی نہ گیا ۔ وہ وہیں زمین پر لیٹا لیٹا ہانپتا رہا ۔ لاچی نے آگے بڑھ کے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا ۔ اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گئی ۔ اور بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر بولی ۔ میرے سردار ! مجھے اپنے خیمے میں لے چلو ۔

دمارد نے اسے زور سے لات مارنے کی کوشش کی ۔ لیکن لات کھانے سے پہلے ہی لاچی وہیں زمین پر دوہری ہو گئی اور وہیں خاک پر لوٹتی ، چکریاں لیتی دمارد سے اور دور چلی گئی ۔ اور دمارد اپنی لات کے جھٹکے سے پھر زمین پر گرا ۔ لاچی زور زور سے ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی اور اب تو سردار کی حالت دیکھ کر مامن اور اس کی بیوی سے بھی نہ رہا گیا ۔ وہ بھی زور زور سے ہنسنے لگے ۔ دمارد کو بہت غصہ آیا ۔ بولا ۔

مامن تم لوگوں نے اسے ساٹھ سے تین سو کے عوض میرے ہاتھ بیچا ہے یا لڑکی میرے حوالے کرو ۔ یا میرا روپیہ مجھے واپس کر دو ۔

مامن بولا ۔ روپیہ نہیں مل سکتا ۔

مامن کی بیوی بولی ۔ لڑکی مل جائے گی ۔ ذرا صبر کرو ۔ لاچی بولی ۔ روپیہ مل جائے گا میرا خیال چھوڑ دو ۔ دمارد کا بند بند دکھ رہا تھا ۔ اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا تمہارے خیال کی ایسی تیسی ۔ میرا روپیہ واپس کرو ۔

مامن کی بیوی بولی ۔ روپیہ نہیں ملے گا ۔

تو لڑکی دو ۔

لڑکی بھی نہیں ملے گی ۔ لاچی بولی ۔

تو روپیہ دو ۔ دمارو بولا ۔ نہیں تو میں معاملہ پنچایت میں رکھوں گا تمہیں برادری سے خارج کر دوں گا ۔

شہروں میں آج کل کسی کا برادری سے خارج ہونا کوئی ایسے قہر کی بات نہیں ہے ۔ لیکن کسی خانہ بدوش کے لئے اپنے قبیلے سے الگ ہونا قیامت سے کم نہیں ہے ۔

مامن کانپ گیا ۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا ۔ روپیہ واپس کر دینا چاہیے ۔

لاچی کی ماں بولی ۔ ہرگز نہیں ۔ اس کمینا کے لئے پھر ساڑھے تین سو کہاں سے ملے گا ۔

لاچی نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولی ۔ میں تیری بیٹی ہوں ماں ۔

لاچی کی ماں بولی ۔ کچھ بھی ہو جائے ۔ روپیہ دمارو کو واپس نہیں ملے گا ۔ ہم نے لڑکی بیچ دی ۔ شریفوں میں جب ایک بار سودا ہو جاتا ہے تو پھر واپس نہیں ہوتا ۔ سودا ۔ سودا ہوتا ہے ۔

ہاں یہ ٹھیک ہے سودا ۔ سودا ہوتا ہے ۔ مامن بولا ہم نے لڑکی بیچ دی ۔ تم لاچی کو لے جاؤ ۔

مگر میں لاچی کو کیسے لے جاؤں ۔ دمارو ایک عجیب بے بسی کے عالم میں بولا ۔

لاچی چیخ کر ہنس پڑی ۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی ۔ دمارو کی نقل کر کے بولی ۔ جیسے بھی ہو مجھے لے جاؤ میرے مالک ۔

سُور کی بچی ۔ دمارو غصے سے بولا ۔

سور کا بچہ ۔ لاچی بہت پیار سے بولی ۔

دمارد کچھ کہتا کہتا رک گیا۔ آخر وہ اپنے پر جبر کر کے لاچی کے بالکل قریب چلا گیا۔ اور انتہائی سنجیدگی سے اس سے کہنے لگا۔ میں تم پر اس کا فیصلہ چھوڑتا ہوں۔ تم فیصلہ کرو مجھے کیا ملنا چاہیئے۔ لاچی یا ساڑھے تین سو روپے۔ جو تم فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہوگا۔

لاچی کی گہری سبز ہنستی آنکھیں ایک دم سنجیدہ سایوں میں کھو گئیں۔ اس نے اپنی ماں اور چچا کے حریص سخت گیر چہروں کی طرف دیکھا۔ پھر دمارد کے سلگتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اسے دمارد پر رحم آگیا بولی۔ تجھے تیرا روپیہ واپس مل جائے گا۔

کب۔ جب ہمارا قبیلہ بہار کا جشن منائے گا۔

مگر وہ تو تین مہینے کے بعد آئے گا۔ جب تک میں کیا کروں گا۔

میں تین مہینے کے اندر اندر تیرا روپیہ چکا دوں گی۔

اگر نہ چکا یا تو۔

تو تیرے پاس آجاؤں گی۔ تیری لونڈی بن کر رہوں گی۔ جو تو کہے گا وہی کروں گی۔

دمارد نے لاچی کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اور اس کا دل خوشی سے لرزنے لگا۔ اور آہستہ سے کہا۔ خدا کرے تو کبھی روپیہ نہ چکا سکے۔ اتنا کہہ کر دمارد تیزی سے پلٹا اور اپنے خیمے کی طرف چلا گیا۔

ماں اور اس کی بیوی خیمے کے باہر سوئے ہوئے تھے لاچی خیمے میں سوئی تھی۔ لیکن آج لاچی کو دیر تک نیند نہ آئی۔ اور وہ دیر تک خیمے کی جالی ہٹا کر آسمان کو دیکھتی رہی۔ اور دیر تک اس کا دل کسی دور افتادہ ستارے کی طرح لرزتا رہا۔ میں کیا چاہتی ہوں۔ اے پُراسرار آسمان کیوں میرا دل دوسری خانہ بدوش لڑکیوں کی طرح نہیں ہے۔ کیوں میں دھندہ نہیں کر سکتی۔ کما نہیں سکتی۔ اپنا جسم نہیں بیچ سکتی۔ میں تو ان سب لڑکیوں سے زیادہ خوبصورت ہوں۔ پھر یہ کیسا دل ہے میرا؟ جو اپنے قبیلے اس کے رسم و رواج اس کی صدیوں پرانی ریت سے انکار کرتا ہے کیوں میں ایک خیمہ نہیں چاہتی۔ ایک گھر چاہتی ہوں۔ جب بس اڈے پر

آگر رکی ہے تو اس کے بیڑے بیڑے کیؤ میں سینکڑوں ایسے آدمی کھڑے ہوتے ہیں جو ہاتھوں میں سازو سامان سے بھرے ہوئے تھیلے لیئے۔ تھکے ہوئے قدموں سے گھر جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ہی بس سے۔ ایک ہی سڑک پر اپنے ایک ہی گھر کو جاتے ہیں اور ہم خانہ بدوش مختلف راستوں پر چل کر مختلف منزلوں سے گھومتے ہوئے کس گھر کو جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اے چپ چاپ ننگے تھکے او نگھتے آسمان کچھ تو بول۔ میرے دل میں ہلچل کیسی ہے کیوں میں چاہتی ہوں کہ بس کے اس لا نبے اداس کیؤ میں کوئی اداس مرد میرے لئے تھیلا لئے کھڑا ہو اور ہر لحظہ مجھ تک پہنچنے کی تمنا کرتا ہو۔ وہ لوگ دیکھتے ہیں مجھے۔ کبھی کبھی کسی کی نگاہ جم جاتی ہے مجھ پر۔ لیکن وہ نظر۔ وہ اچٹتی پھسلتی ہوئی نظر میری ہوتی ہے۔ وہ میرا مرد نہیں ہوتا میں چاہوں تو اپنے حسن کے زور سے اس کی زندگی کے چند لمحے۔ چند گھنٹے۔ چند دن۔ چند ماہ چھین سکتی ہوں۔ لیکن وہ مرد میرا نہ ہوگا۔ جس طرح وہ کیؤ میں کھڑا اور جس طرح وہ بس کا انتظار کر رہا ہے اور جس طرح کی تصویر اس کی آنکھوں میں ہے اور جس کا تصور اس کی آنکھوں میں ہے۔ اور جس میٹھے اور مہربان انداز میں اس نے ڈھاک کے پتوں میں بیوی کے لئے چمپا دیتی کو چھپا رکھا ہے

وہ انداز میری روح کو کھائے جا رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں اس بس کے کیؤ میں کھڑے ہر مرد کا منہ نوچ لوں۔ ہلئے اپنے پژمردہ تھکے ہوئے اداس اور جھنجلائے ہوئے چہروں کے باوجود یہ لوگ اندر سے کیسے خوش نظر آتے ہیں۔ جیسے تاریک بادلوں میں بجلی کوندتی ہے۔ جیسے میلے کچیلے خیمے کے روزن میں سے بہار کی خوشبو آتی ہے۔ اسی طرح ان مردوں کے سانولے۔ میلے پسینے میں نہائے ہوئے چہروں کے اندر بار بار کیسی کیسی شمع سی روشن ہو جاتی ہے۔ کس کے تصور سے ان کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے۔ میں بھیک مانگتی مانگتی شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔ اور میرے سینے میں ہوک اٹھتی ہے کہ کاش میرے لئے کوئی تھک جائے چور ہو جائے۔ اس قدر مجبور ہو جائے کہ اگر اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو تو چلتے چلتے کسی جھاڑی سے ایک پھول ہی توڑ کر میرے لئے لے آئے۔

ارے یہ کیسا دل ہے میرا۔ دوسری خانہ بدوش لڑکیاں سے کتنا الگ ہے۔ جو اپنے قبیلے میں رہتی ہیں۔ خیمہ در خیمہ، شہر در شہر اور گاؤں در گاؤں گھومتی ہیں۔ جن کا ایک زندگی کا خاوند ہوتا ہے اور ایک رات یا ایک گھڑی کا خاوند بھی ہوتا ہے اور دونوں خاوندوں میں کوئی چپقلش نہیں ہوتی۔ بلکہ خاوند اپنی خوشی سے اپنی بیوی کو سجا کر باہر بھیج دیتا ہے۔ وہ ایک رات یا ایک گھڑی گزار کر آتی ہے اور اس طرح آتی ہے جیسے اپنا جسم نہیں ایک عینک، ایک چھلا بیچ کے آئی ہے۔ اور آتے ہی اپنی ساری کمائی اپنے شوہر کے قدموں میں ڈال دیتی ہے اور اس کے گلے سے لپٹ جاتی ہے۔ میرا جسم، عینک یا چھلا کیوں نہیں۔ کیوں وہ اپنی ہی روح کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے جس کی بے حرمتی میں برداشت نہیں کر سکتی۔ اے نیلے، بہت سے غلیظ سا سے آسمان تم نے مجھے کیوں ان خانہ بدوشیوں میں پیدا کیا۔ پیدا کیا تھا تو روح بھی ایسی دیتا۔ جو ہر آن اور ہر لحظہ نت نئی جگہوں کا لالچ لے کے آتی۔ میں تو پیڑ کی طرح ایک جگہ گڑ جانا چاہتی ہوں۔ چاہتی ہوں ایک ہی جگہ میرا گھنا سایہ بڑھے۔ ایک ہی جگہ میرے پھولوں کی خوشبو پھیلے اور میرے پھلوں کا رس چھلکے۔

مجھے بہار بھی وہیں آئے اور خزاں بھی وہیں۔ اور اسی جگہ کی سردی گرمی کھا کر مجھے موت آ جائے۔ اور میں اسی دھرتی میں سما جاؤں۔ لیکن یہ جلتے ہوئے خیمے۔ یہ بدلتے ہوئے گرد۔ یہ گزرتے ہوئے مناظر جہنم، جہنم۔

اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی لاچی دھیرے دھیرے غم کے مارے سسکنے لگی۔ لاچی ایسی عجیب لڑکی تھی کہ جس ماحول میں رہتی تھی اس سے الگ سوچتی تھی۔ لاچی ایسی خوب صورت لڑکی تھی اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو سیب کا پیڑ ہوتی۔ پہاڑ کی کنواری برف میں ڈھکی ہوئی چوٹی ہوتی، یا زیرِ آب سمندر کی دلہن میں مستور کورل کا گلابی محل ہوتی۔ لیکن قدرت نے اسے عورت بنایا تھا اور ماحول اور اتفاق نے اسے خانہ بدوش بنا دیا تھا۔ اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ کبھی انسان سے انصاف نہیں کرتیں۔ قدرت، ماحول، اتفاق ان تینوں چیزوں کے زبردست ہاتھوں سے انصاف کو چھیننا پڑتا ہے۔

لاچی کی آنکھوں میں آنسو ابل آئے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اور

ایک گہرے مصمم ارادے سے اپنے آپ سے کہا۔ میں چھین لوں گی۔ میں حاصل کر کے رہوں گی۔

اس نے اُلٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھے اور زمین پر لیٹ گئی۔

یکایک خیمے سے پیچھے سے آواز آنے لگی جیسے کوئی خیمے کے پردے پر مٹھی بھر بھر کر ریت گرا رہا ہو۔

لاچی اُٹھ بیٹھی۔ دیر تک اس آواز کو سنتی رہی۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے آہستہ سے آہ بھری۔ جیسے کسی نے آہستہ سے کہا۔ لاچی لاچی یکایک خیمے کے باہر سے نکل کر باہر آ گئی۔ باہر گل کھڑا تھا۔

چوتھا باب

گل بلوچی کا لڑکا تھا۔ اور بلوچی کو سب لوگ جانتے تھے۔ کیونکہ بلوچی ریلوے ملازموں کو اور آس پاس کے رہنے والے سرکاری ملازموں کو روپیہ سود پر دیا کرتا تھا۔ گل بلوچی کا بیٹا تھا۔ مگر باپ اور بیٹے میں بہت فرق تھا۔ لاچی نے گل کو اکثر ریلوے اسٹیشن پر اور ریلوے کے کوارٹروں میں بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔ گل کا قد تو اپنے باپ کی طرح پورا چھ فٹ اونچا لانبا تھا۔ چھ فٹ کے قریب لیکن گل کا قد تو اپنے باپ کی طرح چوڑا چکلا اور فربہ اندام نہ تھا۔ دبلا پتلا اور اکہرے جسم کا تھا۔ بلوچی کی بھنویں گھنی تھیں اور بڑے بڑے گل مچھے تھے لیکن گل کلین شیو تھا بلوچی پرانے وضعدار لوگوں کی طرح کلاہ لنگی اور شلوار قمیص پہنتا تھا۔ لیکن گل پینٹ اور بش شرٹ پہنتا تھا۔ بلوچی کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوفناک تھیں۔ اور جب وہ آنکھیں سرخ کر کے کہتا۔

"تم سود کا روپیہ کیوں نہیں لائے"

تو وہ لوگ ڈر کے مارے تھرتھر کانپنے لگتے تھے۔ گل کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں لیکن ہر وقت جیسے سپنا دیکھتی رہتی تھیں۔ اور بلوچی کہا کرتا تھا کہ یہ سب فرق اس لئے ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو ایف اے تک پڑھا دیا ہے۔ پڑھ لکھ کر بچے کی صحت غارت ہو جاتی ہے وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

لیکن گل اپنے باپ کا بہت کام کرتا تھا۔ اس کی میٹھی زبان اور حسن سلوک سے متاثر

جو اکثر قرضدار باپ کی بجائے بیٹے ہی سے بزنس کرنا پسند کرتے تھے بلوچی کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لئے وہ روپے کی وصولی کو اکثر اپنے بیٹے کو بھیجا کرتا تھا۔ لیکن وصولی کے سلسلے میں بے حد محتاط تھا۔ ایک ایک پائی کا حساب اپنے بیٹے سے لیا کرتا تھا۔ اگر بیٹا چار چھ روپے سود کے چھوڑ دیتا تو اس سے گھنٹوں جھگڑتا تھا۔ غراتا تھا اور اگر بہت غصے میں ہوتا تھا تو گل کے ایک دو جڑ بھی دیتا تھا۔ اور گل ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح سب سہہ لیتا تھا۔

اس وقت گل کو اپنے سامنے آدھی رات کے وقت دیکھ کر لاچی کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ بولی۔

تم بلوچی کے بیٹے ہو۔

ہاں! میں گل ہوں۔

کیا میرے باپ یا ماں نے تمہارا کوئی قرضہ دینا ہے؟

نہیں۔

پھر کیوں آئے ہو

گل چپ رہا۔

بولو۔ لاچی ذرا تیزی سے بولی۔

گل نے کہا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

کہو۔

یہاں نہیں۔

تو پھر کہاں؟

گل نے گھوم کر جدھر اشارہ کیا۔ ادھر ریلوے کا پرانا پل تھا۔ اسٹیشن یارڈ کے ادھر سگنلوں کے قریب ایک زنگ آلود کہنہ پل تھا۔ جو اب استعمال نہ ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں یہ پل استعمال ہوتا ہوگا۔ جب یارڈ چھوٹا تھا اور اسٹیشن گمنام سا تھا۔ اس زمانے میں یہ پل استعمال ہوتا ہوگا۔ لیکن اب۔ اب تو یارڈ اس پل کے دونوں طرف پھیل گیا تھا۔ اور یہ پل جس کے

پیچھے سے اب یہ صرف دو ریلوے لائنیں گزرتی تھیں ۔ یارڈ کی درجنوں پھیلی ہوئی چمکتی ہوئی فولادی لائنوں کے درمیان ایک بڈھے ناکارہ پنشن خوار ملازم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ عرصے سے ریلوے کے حکام نے اس پل کا جوڑ جوڑ الگ کر کے اسے یہاں سے ہٹا دینے کے احکام جاری کر رکھے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس پل کی ہستی کو بھول گئے ہیں ۔ اس لئے تو یہ پل ابھی وہیں کھڑا تھا۔ نہ جیتا نہ مرتا تھا۔ اس زنگ آلود بے چارگی پر کسی کو ترس نہ آتا تھا۔

گل نے کہا۔ اس پل پر چلیں گے۔

اس پل پر کیوں ۔ لاچی نے کہا ۔ نہیں بتا دو۔

میرے ساتھ جانے سے ڈرتی ہو۔ گل نے پوچھا۔

ڈرتی تو میں اپنے باپ سے بھی نہیں۔ تم سے کیا ڈروں گی۔

اتنا کہہ کر لاچی گل کے ساتھ ہو لی۔ خیموں کے پیچھے ہوتے ہوئے وہ ریلوے کا فولادی جنگلا کھول کر یارڈ کے اندر چلے گئے ۔ اور تھوڑی دیر کے بعد پرانے پل کی سیڑھیوں پر آ پہنچے۔ ذرا احتیاط سے۔ گل نے لاچی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ بیچ بیچ سے سیڑھیاں غائب ہیں ۔

اسی بہانے میرا بازو مت پکڑو ۔ لاچی نے اپنا بازو گل سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ میری بھی آنکھیں ہیں ۔ میں بھی دیکھ سکتی ہوں۔ تم آگے آگے چلو ۔ میں تمھارے پیچھے آتی ہوں

گل نے فوراً لاچی کا بازو چھوڑ دیا ۔ اور آگے آگے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں پل کے اوپر پہنچ گئے ۔ یہاں سے اسٹیشن یارڈ اس کی ہری اور لال بتیاں دور تک چمکتی ہوئی فولادی لائنیں۔ سرمئی دھاریوں کی طرح ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی دور فضا میں گم ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھیں ۔ ادھر ریلوے اسٹیشن پر سناٹا تھا۔ ادھر خانہ بدوشوں کے خیموں سے پرے گل مہر کے درختوں کی ننگی سنناتی بانہیں فضا میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ گویا مصروف دعا گویا منتظر فصل بہاراں ۔

گل نے کہا۔ ان ننگی شاخوں پر کب پھول کھلیں گے۔ اے بلوچی کے بیٹے ۔ لاچی

بڑی نخوت سے بولی۔ تمہیں مجھ سے کیا کام ہے۔ صاف صاف بولو۔ پھولوں کا جھانسہ مجھے مت دو۔ میں ہر روز ایسی باتیں سنتی ہوں تو میرے دل کا پھول ہے۔ تو میرے من کی رانی ہے۔ تو میری دلنواز جان ہے۔ اگر میں یہ باتیں نہیں سنتی ہوں۔ تو میں مادر زاد حرامزادی کتیا ہوں۔ رنڈی اور گشتی ہوں پل۔ کیا سمجھے؟ مجھے تیرے باپ کا کوئی قرضہ نہیں دینا ہے۔

گُل پل کے پرانے آہنی جنگلے پر جھک گیا۔ آہستہ بولا۔ میں یہاں ہر روز آتا ہوں۔ اسی وقت رات کے دو بجے۔ جب یہاں کوئی نہیں ہوتا اور تیرے مجھے کو تکا کرتا ہوں۔

لاچی مسکرا کے بولی۔ اب بات سمجھ میں آئی۔

گل نے کہا۔ مجھے یہ پل بہت پسند ہے۔ کیوں کہ یہ پل کہیں جاتا نہیں۔

لاچی نے پوچھا۔ کہیں جاتا نہیں کا کیا مطلب؟ کیا دوسرے پل کہیں جاتے ہیں۔ سبھی پل اپنی جگہ پر پڑے رہتے ہیں۔

گل بولا۔ ہاں! لیکن دوسرے پلوں کے مسافر تو کہیں جاتے ہیں نا۔ دوسرے پل کسی کو کسی سے ملاتے ہیں۔ لیکن یہ پل کسی کو کسی سے نہیں ملاتا۔ نہ کسی سڑک کو کسی سڑک سے۔ نہ کسی شہر کو کسی شہر سے نہ گھر کو کسی گھر سے۔ نہ کسی انسان کو کسی انسان سے!

چھک چھک کرتی ہوئی مال گاڑی دیر سے آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اب تو وہ اتنے قریب آ گئی اس کا سیاہ انجن مہیب اور بھیانک اور دیو زاد معلوم ہونے لگا۔ دوسرے لمحے وہ مال گاڑی شور مچاتے ہوئے پل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ اور پرانا پل زور زور سے ہلنے لگا۔ اور اس کی ہر چول کھڑکھڑانے لگی۔ یکایک پل اتنے زور سے ہلا کہ لاچی ایک چیخ مار کر گل سے لپٹ گئی۔

پل پھر ساکت ہو گیا۔ لاچی گل سے الگ ہو گئی۔ لیکن گل کا ہاتھ بہت دھیرے دھیرے سرک کر لاچی کے ہاتھ سے الگ ہوا۔

گل نے مسکرا کے کہا۔ میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔ میرا خیال تھا تم عورت ہو۔

لاچی نے بڑی حقارت سے گل کی طرف دیکھا اور بولی۔ اب اس کے بعد یہ کہہ دو کہ میں خوبصورت

رہوں۔ بہت خوب صورت ہوں۔ تم مجھ پر مرتے ہو اور میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے تمہارے سوا۔ خدا کے لئے وہ سب باتیں فوراً کہہ ڈالو جنھیں سنانے کے لئے تم مجھے اس پل پر لائے تھے۔

گل چپ رہا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ لیکن ہمت کر کے وہ انہیں پی گیا اس نے ایک آنسو بھی نیچے نہیں گرنے دیا۔ پھر آہستہ بولا۔

میں تمہیں یہ پل دکھانے لایا تھا۔ یہ پل جو کہیں جاتا نہیں۔ میری امیدوں کی طرح۔ پڑھے لکھے ہو نا! اسی طرح بات گھما پھرا کے کہو گے۔ لیکن مطلب وہی ہے۔ دوسروں کی طرح تم بھی میری عزت لینا چاہتے ہو۔ آخر کیوں نہ ہو۔ میں ایک خانہ بدوش لڑکی ہوں۔

گل نے دانتوں تلے اپنا نچلا ہونٹ رکھ لیا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ صرف اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ بولی۔

چلو اب عشق ہو چکا۔ مجھے خیمے تک چھوڑ آؤ۔ ہاں تم نے یہ بتایا ہی نہیں کہ عشق بازی کرنے کے مجھے کتنے پیسے دو گے؟

گل تیزی سے گھوما۔ اس کا ہاتھ لاچی کو مارنے کے لئے اٹھ گیا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ اور لاچی کی طرف پشت کر کے وہ تیزی سے پرانے پل کی سیڑھیاں اتر کے چلا گیا۔ وہ تیزی سے ریل کی پٹریاں پھلانگتا ہوا اپنے گھر جا رہا تھا۔

لاچی وہیں پل پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

اور دیر تک ہنستی رہی۔

جب وہ اس کی نظروں سے غائب ہو گیا وہ دھیرے دھیرے اس پل سے نیچے اتری اور اپنی کمر کو رقص کے انداز میں جھلاتی ہوئی اپنے خیمے کو چلی گئی۔

دوسرے دن لاچی نے روشی سے مشورہ کیا۔ روشی کی عمر تیس سال سے اوپر ہو گئی۔

اس کا حسن پکھتا جا رہا تھا۔ جیسے وہ سرخی غازے سے ہر روز جلا دیتی تھی۔ روشنی خانہ بدوشس لڑکیوں میں سے چنٹ اور خرانٹ اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس کے گاہک سب سے زیادہ امیر ہوتے ہوتے تھے۔ اور اس کے کپڑے سب سے زیادہ قیمتی ہوتے تھے۔ اور اس کا شوہر جمعدارن دن رات شراب پیتا تھا۔ اور روشنی کی آمدنی کا بیشتر حصہ شراب اور جوئے میں صرف کرتا تھا۔ اور روشنی کو مہینے میں دو چار بار پیٹ دیا کرتا تھا۔ روشنی انتہائی سعادت مندی سے مار کھایا کرتی تھی۔ کیوں کہ اس کا اعتقاد تھا کہ اس دُنیا میں ہر شوہر کو اپنی بیوی کو پیٹنے کا حق حاصل ہے مار کھا کر وہ پٹائی کو پسند بھی کرنے لگی تھی۔ بلکہ جب زیادہ دن ہو جاتے تو روشنی کی کھال خود اس پٹائی کے لئے تلملانے لگتی تھی۔ اس کے سارے جسم میں خارش سی ہونے لگتی تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے اپنے شوہر سے اُلجھ پڑتی۔ اور پھر پٹ کر اپنے خاوند کے پاؤں دبانے لگتی۔ اسے اپنے خاوند سے بڑی محبت تھی۔ محبت تو اسے اپنے گاہکوں سے بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ تو بس گھڑی دو گھڑی کی محبت ہوتی تھی۔ لیکن خاوند۔ خاوند ہے اور گاہک تو صرف گاہک ہیں۔ دوکان سے سودا تو ہر کوئی خریدتا ہے۔ لیکن دوکان کا مالک صرف ایک ہی ہوتا ہے۔

روشنی بہت سمجھ دار عورت تھی۔ وہ زندگی سے بڑی خوب صورتی سے مفاہمت کرنا جانتی تھی۔ دراصل یہ دُنیا ایسی ہی سمجھ دار عورتوں اور مردوں پر قائم ہے ورنہ کب کی ختم ہو گئی ہوتی۔ اس لئے روشنی نے لاچی سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔ روشنی نے بات سُن کے کہا۔

ساڑھے تین سو روپے۔ ساڑھے تین سو روپئے کیا چیز ہیں تیرے لئے تو ہاں کر میں ابھی ساڑھے تین سو کا گاہک دلائے دیتی ہوں۔

لیکن مجھے گاہک نہیں چاہئے۔

تو گاہک کے بغیر ساڑھے تین سو کہاں سے ملیں گے۔ روشنی حیرت سے بولی۔ تو روپیہ بھی چاہتی ہے۔ اور دھندہ بھی نہیں کرے گی۔ ایسا کیسے چلے گا۔

اگر ایسا نہیں چلے گا تو پھر۔ مجھے بھی کچھ نہیں پتا ہے۔

دیر تک لاپی کو جاتے ہوئے دیکھ کر کچھ سوچتی رہی - پھر دل ہی دل میں ہنسی - کیسی پگلی لڑکی ہے - اسے کبھی عقل نہیں آئے گی - اس کے بعد وہ پرانی عینکوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کرنے لگی -

ایک بابو اس کے سر پر آ کھڑا ہوا -

روشی نے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور مسکرا دی بابو عینک چاہیے -

بابو بولا - عینک تو میری آنکھوں پر موجود ہے - پھر کیا چاہیے ؟ چھلا ، انگوٹھی - جھمکے نگینے جو لینا ہو لے لو - روشی ہنس کر بولی -

مجھے ایک موتی چاہیے ! بابو نے آنکھ مار کر اس سے کہا -

پانچواں باب

روشنی سے ہٹ کر لاچی مادھو کی دکان پر آئی اور سیبوں کی ٹوکری سے ایک سیب اٹھا کر کھانے لگی ۔ مادھو ذرا سا مسکرا دیا ۔ کیوں کہ اس کی دکان پر اس وقت دو تین گاہک کھڑے تھے اور وہ سودا بیچ رہا تھا ۔ جب گاہک چلے گئے تو لاچی نے تین چوتھائی سیب کھا لیا تھا ۔ مادھو نے ٹوکری سے ایک اور سیب اٹھایا اور لاچی کو پیش کیا ۔ لاچی نے پہلا سیب نالی میں پھینک دیا اور مادھو کا پیش کیا ہوا سیب کھانے لگی ۔ سیب کھاتے کھاتے بولی ۔

مادھو تم مجھے بہت چاہتے ہو ؟ ۔

مادھو جواب میں کھلکھلا کے ہنس پڑا پھر اس نے شرم سے منہ پھیر لیا ۔

لاچی کو مادھو کی یہ ادا بہت پسند آئی ۔ وہ بولی ۔

بتاؤ نا مادھو ۔ تم مجھے کتنا پسند کرتے ہو ۔

مادھو شرماتے ہوئے بولا ۔ اپنی روجی سے جیادہ ۔ اپنی دکان سے جیادہ ۔ اپنے رزق سے بھی جیادہ ۔

جو میں کہوں گی اسے پورا کرو گے ۔ لاچی بولی ۔

مادھو کے دل میں نہ جانے کہاں سے دلیری آگئی ۔ اک دم بول اٹھا ۔

تم چاہو تو دکان چھوڑ دوں ۔ یہ سارے پھل نالی میں پھینک دوں ۔ تم چاہو تو میں گاڑی

کے آگے لیٹ جاؤں ۔ تم چاہو تو ....

بس بس ۔ لاجی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ۔ میں بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم میرے لئے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے کا بندوبست کر دو ۔

ساڑھے تین سو ۔ مادھو اک دم بجھ سا گیا ۔ ساڑھے تین سو کہاں سے لاؤں گا ۔ میری تو ساری پونجی پھل ہیں ۔ سا ٹھ ستر کے یہ پھل ہوں گے ۔ پچاس ساٹھ میرے گھر میں ہوں گے ۔

میں نہیں جانتی کہ تم کہاں سے لاؤ گے ۔ مگر تم میرے لئے لاؤ گے ۔ نہیں تو میں زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گی ۔ لاجی اک ادا سے خفا ہو کے بولی ۔

نہیں نہیں ۔ مادھو گھگھیا کے بولا ۔ لاجی اتنی خفا نہ ہو ۔ دیکھ میری طرف دیکھ لے بس ایک نظر سے دیکھ لے ۔

اچھا دیکھتی ہوں ۔

لاجی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں چمکائیں ۔ اور مادھو کے دل میں جیسے بجلی کوند گئی ۔ ایک لمحہ کے لئے وہ جیسے سر سے پاؤں تک پگھل گیا ۔ آہستہ سے بولا ۔ دیکھ آج شام کو آنا میں کہیں سے بندوبست کرتا ہوں ۔

اچھا کہہ کر لاجی مادھو کی دکان سے چلی گئی ۔ اس کے سر سے بوجھ اُتر گیا تھا ۔ اس دن اس نے یارڈ سے سرکاری کوئلہ چرایا ۔ اور حلوائی کے ہاں بیچ کر ڈیڑھ روپیہ وصول کر لیا ۔ اس ڈیڑھ روپے کو حاصل کرنے کے لئے اسے یارڈ کے تین چکر لگانے پڑے ۔ اس کے بعد اس نے ریلوے کوارٹروں کے کئی چکر لگا ڈالے ۔ آخر وہ گل بجانی ٹکٹ چیکر کے پچھواڑے سے ایک پلا ہوا مُرغ چرانے میں کامیاب ہو گئی ۔ اس کا خیال تھا کہ اس مُرغ کے اسے ساڑھے تین روپے ضرور مل جائیں گے ۔ مگر قصائی نہ مانا ۔

یہ حرام کا مال ہے ۔

مگر پلا ہوا ہے ۔ میں اس کے ساڑھے تین لوں گی ۔

میں ڈیڑھ سے زیادہ نہ دوں گا۔
ڈیڑھ دے کر تم پانچ میں بیچو گے۔ کچھ تو شرم کرو۔ میں ایک غریب خانہ بدوش لڑکی ہوں۔
میں ایک غریب قصائی ہوں۔
مجھے ساڑھے تین سو کا قرضہ چکانا ہے۔
میرے پانچ بچے ہیں تین بیویاں ہیں۔
چوتھی کی فکر کب کرو گے۔
لاچی نے مذاق کیا۔
جب تم ہاں کر دو گی۔
لاچی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ بولی۔
اچھا چلو تین روپے دے دو۔
پونے دو۔
اچھا ڈھائی دے دو۔
دو لینے ہوں تو لے جاؤ۔ ورنہ ہاں سے بھی جاؤ گی۔ اُدھر سامنے سے پولیس کا سنتری چلا آرہا تھا۔ لاچی ڈر گئی۔ اس نے جلدی سے مرغ قصائی کے حوالے کر دیا۔ اور اس سے دو روپے لے کے چلتی بنی۔ اب تک اس کی جیب میں ساڑھے تین روپے آ چکے تھے۔ مگر اس طرح سے کیا ہو گا لاچی چند لمحوں کے لئے فکر میں ڈوب گئی۔ پھر اس کے دل میں دھندے کا خیال اور اس کی بشاشت لوٹ آئی۔ اور وہ قصائی کے ہاں سے لوٹ کر سارا بازار گزر کے واپس بس کے اڈے پر آ گئی۔ بھیک مانگنے کے لئے۔ بس کے اڈے پر صرف دو مچھلیاں بیچنے والیاں کھڑی تھیں۔ مارکیٹ میں مچھلیاں بیچ کے آئی تھیں اب خالی ٹوکریاں لئے ہنس ہنس کے ایک دوسرے سے بات کر رہی تھیں۔ جب لاچی نے دست سوال آگے بڑھایا تو ان میں سے ایک جھڑک کر بولی۔
شرم نہیں آتی مسٹنڈی! جوان جہاں لونڈا سی ہو کر بھیک مانگتی ہے۔ جا کوئی گھر کر لے۔

تیرے گھر چلی جاؤں ۔ لاچی نے چہک کر جواب دیا ۔

مچھلی والی اسے مارنے کے لئے دوڑی ۔ لاچی ہنستے ہوئے بھاگ گئی ۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں مچھلی والیاں ایک بس میں سوار ہو کر چلی گئیں اور اڈہ پھر خالی ہو گیا ۔

لاچی پھر اڈے پر واپس آ گئی ۔ اب کے دھنیا بھکارن بوڑھی اور اندھی اڈے پر کھڑی خالی اڈے پر بھیک مانگ رہی تھی ۔

لاچی نے اسے سمجھایا ۔ اڈہ خالی ہے ۔ تو کس سے بھیک مانگتی ہے ۔ تم کون ہو ۔ دھنیا بھکارن اپنی کراری کراری آواز میں بولی ۔ میں بھی تیری طرح ایک بھیک مانگنے والی ہوں ۔ لاچی یہ کہہ کر زور سے ہنسی ۔

جوان ہنسی ہے تیری ۔ دھنیا غصے سے بولی ۔ لعنت ہو تجھ پر کیوں مجھ غریب بھکارن کی روزی تباہ کر رہی ہے ۔

میں کیا کہہ رہی ہوں تجھے ۔ لاچی حیرت میں بولی ۔

تیرے ہوتے ہوئے مجھے کون بھیک دے گا ۔ دھنیا بہت افسردگی سے بولی ۔ کیسا زمانہ آیا ہے ۔ لوگ بھیک دیتے ہیں تو اچھی صورت دیکھ کر ۔ غریب اندھی بڈھی کو کوئی نہیں پوچھتا ۔

یہ بالکل سچ تھا ۔ اگلے تین چار گھنٹوں میں لاچی نے بھیک مانگ کر ڈھائی روپے کما ئے ۔ لیکن اندھی بڈھی دھنیا کے پاس دس پیسے جمع ہوئے ہوں گے ۔ وہ بھی اسے صرف عورتوں نے رحم کھا کے دیئے تھے ۔ لاچی غور سے دیکھتی رہی ۔ کسی جوان مرد نے اسے ایک پیسہ نہیں دیا ۔ سب لاچی کو گھورتے تھے لاچی کے دل میں ایک عجیب سی مسرت کی لہر آئی ۔ وہ پلٹ کے سامنے پان والے کی دکان پر چلی گئی ۔ اور اس سے دو پیسے کا پان کھا کے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگی ۔ تھوڑی دیر میں پان کی دکان پر بھیڑ لگ گئی تھی ۔

دو پیسے کا گھوڑا مار کر بیڑی دینا ۔

ایک آنے کی سلطان صاحب بیڑی ۔

کونڈرز کا آدھا پیکٹ۔

وہی سادہ۔

کالا کانڈی لونگ سپاری۔

لاچی نے اپنے گھاگرے کے نیفے سے دو پیسے نکال کے پان والے کو دینے چاہے۔ پان والے نے مسکرا کے سر ہلا دیا۔ بولا۔

جانی! بس تو ادھر میری دکان پر آکے کبھی کبھار دو منٹ کے لئے کھڑی ہو جایا کر۔ اپنے تو پان کے پیسے یوں ہی وصول ہو جاتے ہیں۔

ہشت۔ سور کی اولاد۔

لاچی نے پان والے کو گالی دی۔ پھر اس نے زور سے پان کی پیک نالی میں گرا دی۔ اور اپنا نیل جیسنٹ کا گھیرے دار گھاگرا جھلاتی ہوئی مادھو کی دکان پہ چلی گئی۔ کیوں کہ اب شام ہو چلی تھی۔

جب لاچی دکان پر پہنچی تو مادھو اپنی دکان بند کر رہا تھا۔ وہ قریب کھڑی کھڑی اسے دکان بند کرتے دیکھتی رہی۔ مادھو تو اتنی جلدی کبھی دکان بند نہ کرتا تھا۔ رات گیارہ بجے پولیس کی رونڈ آنے سے پہلے کہیں دکان بند کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا؟ یکا یک لاچی کے دل میں خیال آیا۔ یہ کم بخت میرے آنے سے پہلے ہی دکان بند کر کے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ اچھا ہوا میں نے اسے بھاگنے سے پہلے پکڑ لیا۔

لاچی وہیں مادھو کے پیچھے کھڑی رہی۔

چپ چاپ۔

جب مادھو دکان بند کر کے چابیوں کا گچھا جیب میں ڈالتے ہوئے پلٹا اس نے لاچی کو اپنے پیچھے کھڑی پایا۔ وہ ایک دم چونک گیا۔ کچھ جھینپ گیا۔

لاچی بولی۔ کیوں بھاگ رہے تھے مادھو۔

نہیں! مادھو انکار کرتے ہوئے بولا۔ میں تو دکان بند کر رہا تھا اور دکان بند کر کے تیری

ذہ دیکھتا۔

پیسے لائے۔

ششش! آہستہ بول۔ مادھو نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی سُن لے گا۔

سُن لے گا تو کیا کرے گا۔ لاچی بہت بے خوفی سے بولی۔

تو نہیں سمجھتی۔ ادھر آ۔ ٹیکسی میں بیٹھ۔ تجھے بتاتا ہوں۔

لاچی نے مڑ کے دیکھا۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ لاچی مادھو کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور ٹیکسی گھما کے اسٹیشن کے اڈے سے باہر لے گیا۔ باہر سڑک پر جا کر ٹیکسی ایک طرف کر کے روک دی گئی۔ یہاں پر درخت کا گھنا سایا تھا۔ اور ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ تھا۔ یہاں ٹیکسی رکوا کے مادھو نے اپنی جیب سے نوٹ نکالے اور انھیں لاچی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

بڑی مشکل سے سو روپیہ ہوا ہے گن لے۔

دس کے پانچ کے۔ دو کے۔ ایک کے نوٹ تھے۔ میلے اور مڑے ہوئے پسینے اور بدبو کے ملے ہوئے۔ کچھ نقدی تھی۔ اٹھنیاں۔ چونیاں۔ دوتیاں۔ اکنیاں۔ مگر لاچی نے انھیں گن کے کہا۔ یہ صرف ایک سو ہیں۔

یہ میری ساری پونجی ہے۔ اسے رکھ لے۔ لاچی نے روپے رکھ لئے۔

مادھو کے سبزی مائل چکنے ہونٹوں پر رال کا لعاب چمکنے لگا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور اس کی کانپتی ہوئی انگلیاں لاچی کے ہاتھ کو چھونے لگیں۔ اور مادھو آہستہ سے کہنے لگا۔

اب کہیں چلیں گے۔

کہاں چلیں گے۔

لاچی نے پوچھا۔

کہیں بھی سیر کے لئے چلیں گے۔ مادھو کانپتی آواز میں بولا۔ اور اس کی ترستی ہوئی انگلیاں لاچی کے ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ کہنے لگیں۔

یکایک لاچی کے بدن میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کیچوا یا گندی نالی کا کوئی لجلجا پلپلا سا کیڑا اس کے جسم پر رینگ رہا ہو۔ اس نے سو روپے کے نوٹ زور سے مادھو کے منہ پر مارے۔ اور جلدی سے ٹیکسی کا پٹ کھول کے باہر نکل آئی۔ اس کی آنکھوں کی گہری سبز جھیلوں میں غصے کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

کمینے کتے۔

لاچی نے ایک پتھر اٹھایا۔

ڈرائیور نے جلدی سے ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ اور مادھو کو لے کر بھاگ گیا۔ پتھر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ٹیکسی کے ڈنگارڈ کو چھوتے ہوئے نکل گئے۔ شکر ہے ٹیکسی کا کوئی شیشہ نہیں ٹوٹا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے شکر ادا کیا۔ ورنہ لاچی کے غصے سے خدا بچائے۔ غصے میں یوں بھی نشانہ چوک جاتا ہے۔

لاچی نے چوتھا پتھر اٹھایا تھا۔ مگر ٹیکسی غائب ہو چکی تھی۔ اور پتھر اس کے ہاتھ میں تھا لاچی نے ایک لمحے کے لئے پتھر کی طرف دیکھا۔ پھر خالی سڑک کو دیکھا۔ پھر اس نے زور سے پتھر سڑک پر پھینک دیا۔ اور بے بس ہو کر رونے لگی۔ اس کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیا بھی تھی مادھو کو اور مادھو کیا نکلا۔

پبلک ٹیلی فون کے قریب رک کر اس کے دل میں ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ بوتھ کے اندر جا کر خدا کو ٹیلی فون کرے۔ اور اس سے ساڑھے تین سو روپے مانگ لے۔ کیا خدا تک یہ ٹیلی فون نہیں پہنچتا۔ کیوں نہیں پہنچتا۔ آخر کیوں خدا اسے کہیں سے ساڑھے تین سو روپے نہیں دیتا کوئی اتنی بڑی رقم تو ہے نہیں آخر کیوں اس دنیا میں کوئی ایک لڑکی کی عزت کے بغیر اسے ساڑھے تین سو روپے دینے کو تیار نہیں ہے۔

ڈارلنگ! یہاں کیسے ٹیلی فون کرنے کے لئے رکی ہو۔ آؤ میری گاڑی میں

بیٹھ جاؤ۔

لاچی نے پلٹ کے دیکھا۔ خوب صورت آسمان رنگ کی پلاسٹک کی پلائی منہ میں ایک نوجوان کھوڑی پھلاسا اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

لاچی نے ایک پتھر اٹھایا۔

سور پڑ وال غبار چھوڑتے ہوئے روم سے بھاگ گئی۔

چھٹا باب

شام کو جب لاچی ٹیلے سے گھوم کے اپنے خیمے کو جانے لگی تو اس کے باپ نے۔ روز کی طرح دست سوال دراز کیا۔ لاچی نے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور پلٹ کے چلنے لگی۔ رنگی نے آگے بڑھ کے اس کا راستہ روک لیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔

کہاں جاتی ہے میرے پیسے دیتی جا۔

لاچی نے بجلی کی طرح تڑپ کر اپنا ہاتھ رنگی سے چھڑا لیا۔ اور اُلٹے ہاتھ سے ایسے زور کا تھپڑ اس کے منھ پر رسید کیا کہ ہونٹوں سے خون نکل آیا۔ رنگی حیران و ششدر کھڑا رہ گیا۔ آہستہ سے اس نے اپنے ہونٹوں سے لہو صاف کیا۔ اور پھر اپنی ہتھیلی کو غور سے دیکھنے لگا۔ جہاں تر و تازہ اور سرخ لہو کی ایک چمکتی ہوئی لکیر ہتھیلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کھنچی ہوئی تھی۔

لاچی بولی۔

اگر تم میرے باپ ہو تو آئندہ جب تک ساہوکار کا روپیہ نہ چکا دوں کبھی مجھ سے ایک پیسہ بھی طلب نہ کرنا۔

رنگی نے غور سے اپنے خون کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ساڑھے تین سو روپے تم اکیلی کیسے چکاؤ گی۔

تم دیکھتے جاؤ۔

لاچی ایک فیصلہ کن انداز میں بولی۔

رگی نے بہت افسردگی سے کہا۔

تمہارا جسم عورت کا ہے دل مرد کا ہے۔ بس یہی سوچ کر افسوس ہوتا ہے۔

کیوں۔ لاچی نے رک کے پوچھا۔

رگی بولا۔

زندگی مختصر ہے۔ جوانی اس سے بھی مختصر۔ حسن اس سے بھی مختصر ہے۔ اس لئے میرا باپ کہتا تھا۔ کماؤ۔ بچاؤ۔ وقت بچاؤ۔ جہاں تک ہو سکے کام نہ کرو اور ہمیشہ چلتے چلو۔ کسی ایک جگہ بیٹھ جانے سے آدمی شاخ میں لگے پتے کی طرح ایک روز سڑ کر گر جاتا ہے۔ اس نے لہو کو اپنی میلی آستین سے پونچھ دیا۔

لاچی نے کہا۔ مجھے خیمہ نہیں چاہیئے مجھے ایک گھر چاہیئے۔ ایک آہ کے ساتھ ایک عجیب بے قراری کے ساتھ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ نکلے۔

وہ اپنے احساس کی شدت سے خود گھبرا گئی۔ اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔

رگی اسے دیکھتا رہ گیا۔

دمارو اپنے خیمے کے باہر چٹائی بچھائے پی رہا تھا۔ روشنی اور جاں اس کی بغل میں تھیں لاچی نے جاتے ہی چھ روپے نکال کے اس کی ہتھیلی پر رکھے۔ دمارو روپوں کو لے کر ہنسنے لگا اس طرح کتنی مدت میں قرضہ چکاؤ گی۔

اسی مدت میں چکاؤں گی جس کا وعدہ کیا ہے۔ تم فکر کیوں کرتے ہو؟

تمہارے پھول جیسے جسم کی مجھے فکر نہ ہوگی اور کسے ہوگی۔

دمارو ہنسا۔ اس کے ساتھ لڑکیاں بھی ہنسیں۔ لاچی چپ رہی۔

دمارو نے درختوں کی قطار کو غور سے دیکھا۔ ان کی ننگی شاخوں کو گھورا۔ پھر نگاہیں ہٹا کر بولا۔ درخت بھی انتظار کرتے ہیں۔ وہ بھی میرے دل کی طرح انتظار کرتے ہیں۔

ہمارا ابھی بہت دور ہے۔ لاجی اطمینان سے اپنی انگلیاں نچاتی ہوئی اور لپک کر وہاں سے ہولی ہو۔ دارو اپنا دل مسوس کے رہ گیا۔

لاجی کی مستانہ خرامی دیکھ کے جاماں اور روشی کے دل میں رشک کا شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ جاماں نے دانت پیس کر کہا۔ مالزادی بڑی پارسا بنتی ہے۔

دارو نے دھیرے دھیرے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ اک ذرا ٹھہر جاؤ۔ تم دیکھتی جاؤ کیا ہوتا ہے۔

آج لاجی کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ خیمے کی دیواریں قید خانے کی دیواروں کی طرح چاروں طرف سے اس کے قریب سکتی ہوئی۔ اس کا گلا گھونٹتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دور گھڑیال نے بارہ بجائے، ایک بجایا۔ دو بجائے۔ لیکن آنکھوں میں نیند پھر بھی نہ آئی۔ تو لاجی گھبرا کے اٹھی اور خیمے کے پیچھے سے باہر نکل گئی۔ باہر جا کے اس نے اپنی آنکھیں ملیں۔ ایک لمبی سانس لی۔ یکایک اس کی نگاہ دور سامنے کے پرانے پل پر پڑی جس کی پشت پر آؤٹر سگنل کی ہری اور لال بتیاں روشن تھیں پل کے اوپر ایک سایہ کھڑا تھا۔ اور آنا ساکت و جامد جیسے خود بھی پل پر ایستادہ ایک سگنل ہو۔

گل۔

لاجی کے سارے جسم میں بے اختیار ایک انگڑائی آئی۔ اور سر سے پاؤں تک نشے میں جھوم گئی۔ ایک عجیب فتحمندی اور غرور کے احساس سے اس کا رواں رواں سرشار ہو گیا۔ پہلے اس کے جی میں آیا کہ واپس خیمے میں چلی جائے۔ لیکن اس کے قدم پلٹ نہ سکے۔ اور وہیں کھڑی رہ کر اس سائے کو دیکھنے لگی۔ جواب تک جامد و ساکت اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ پھر وہ یکایک تیز تیز قدموں سے پھلانگتی ہوئی پرانے پل کی طرف چل گئی۔

میرا خیال تھا تم ضرور آؤ گی۔

گل نے آہستہ سے اس وقت کہا۔ جب لاجی اس کے قریب آ کر پل پر جھک گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ جھک گیا تھا۔

ہونہہ۔ لاجی نے بڑی نخوت سے کہا۔ میں تو محض اس لئے چلی آئی کہ خیمے میں بڑی

گرمی تھی۔

گل چپ ہو گیا۔ دونوں بہت دیر تک چپ رہے۔

یارڈ بالکل خاموش تھا۔ دور کہیں کسی جانے والی گاڑی کی چھک چھک سنائی دے رہی تھی۔ اور آہستہ آہستہ فضا میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

سنا ہے تمہیں ساڑھے تین سو روپے چاہئیں۔

چھ کم ساڑھے تین سو روپے۔

میں تمہیں کل نہیں تو پرسوں کہیں سے لا دوں گا۔

کہاں سے لاؤ گے۔

میرا باپ سود پر پیسہ دیتا ہے نا۔ اس سے مانگ لوں گا۔ کیا کہو گے۔

جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سچ سچ کہہ دوں گا۔

سچ لا دو گے۔

کل نہیں تو پرسوں۔

پرسوں کہاں پر ملو گے۔

اسی پل پر۔

کس وقت۔

اسی وقت۔

اور اپنی ٹیکسی کہاں کھڑی کرو گے۔

گل حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ کون سی ٹیکسی؟ وہی ٹیکسی جس میں تم روپیہ ادا کر کے مجھے کہیں لے جاؤ گے۔ گل کی سمجھ میں اب بات آئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور اس کے منہ سے ایک آہ نکلی! لاچی نے بہت تلخی سے کہا۔ میرے سامنے یہ آہ نہ بھرو۔ میں جب سے جوان ہوئی ہوں دن بھر یہی آہیں سنتی

ہوں۔ بس کے اڈے میں۔ اسٹیشن کے یارڈ میں قصائیوں کی دکانوں پر۔ گلی میں۔ بازار میں۔ یدھر سے گزرتی ہوں بالکل اسی طرح آہیں سنتی ہوں۔ کیا تم نے اس کتے کو دیکھا ہے جو ہڈی دیکھتے ہی زبان باہر نکالنے لگتا ہے۔

سبھی مرد ایک سے نہیں ہوتے۔

سبھی کتے ایک سے ہوتے ہیں۔

گل نے لاچی کا بازو زور سے پکڑ لیا۔ اس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ وہ لاچی کے بازو کو اپنی انگلیوں کے زور سے مسلتے ہوئے بولا۔

خدا کی قسم بہت خبیث عورت ہو۔ خبیث اور جاہل۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ نفرت ہے۔ نفرت ہے۔

پھر اس پُل پر کیوں ہو۔ لاچی نے یکایک بہت نرم اور گرم آواز میں کہا۔

گل نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے فوراً اپنا ہاتھ لاچی کے بازو سے ہٹا لیا۔

لاچی نے اپنے بازو کو دیکھ کے گل سے کہا۔

دیکھتے نہیں ہو۔ تم نے اپنے ناخن اس میں گڑھا دیئے ہیں جنگلی واقعی لاچی کے سنہری صندل بازوؤں پر ناخنوں کے گڑ جانے سے سُرخ سُرخ نشان پڑ گئے تھے۔ اور ان میں خون جھلک رہا تھا۔ اس خون کو دیکھ کر گل بے تاب ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ لاچی کو اپنے بازوؤں میں اس طرح لے کر اس کی سانس رُک جائے۔ وہ لاچی کی طرف بڑھتا بڑھتا رک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بالوں کو پکڑ لیا اور انہیں زور زور سے جھٹکے دیئے۔ پھر پلٹ کر گل کی طرح لاچی سے کچھ کہے بغیر پُل کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔

لاچی ہنسی۔

آہستہ سے ہنسی۔ پھر زور زور سے ہنسی۔ پھر بالکل ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

بھاگتے بھاگتے گل کو ایسا محسوس ہوا جیسے لاچی اپنے جسم اور روح کی حقارت آمیز ہنسی سے اس پر وار کر رہی ہو۔ وہ تیزی سے بھاگتا ہوا ریل کی پٹریاں پھلانگتا ہوا یارڈ کے دوسری جانب گم ہو گیا۔ جہاں ایک مال گاڑی کتنے دنوں سے گھاس کے گٹھے لادے جانے کا انتظار کر رہی تھی یکایک لاچی ہنستے ہنستے چپ ہو گئی پھر آہستہ سے اپنا وہ بازو اٹھایا جس پر گل کے خون کے سرخ سرخ نشان تھے۔ یہ بالائی کے سے نشان۔ جس پر کسی کی امیدوں کا خون تھا۔ لاچی کو یکایک بہت پسند آ گئے۔ اس نے جھک کر ان نشانوں کو اپنے ہونٹوں سے چوم لیا اور بولی۔

میرے زخم۔ میرے پیارے زخم۔ میرے ننھے منے تارک۔ ناتواں سے زخم۔ اس کے بعد وہ اپنے خیمے میں جا کے بہت اطمینان سے سو گئی۔ بے خوف و خطر۔ ایسی گہری نیند میں مستغرق سوئی کہ جب صبح اٹھی تو دھوپ خیمے کے اندر آ چکی تھی۔ اور چچا ماسن چٹائیاں بُن رہا تھا۔ اور اس کی ماں خیمے کے باہر روٹی پکانے میں مصروف تھی۔

دوسرے دن لاچی نے رات دو بجے تک گل کا انتظار کیا۔ لیکن اسے پُل پر کوئی سایہ نظر نہ آیا۔ تیسرے دن اس نے پھر انتظار کیا۔ لیکن گل پھر کہیں اسے دکھائی نہ دیا چار دن اور انتظار کرنے کے بعد لاچی نے بھی اس واقعے کو اپنا دل سے بھلا دیا۔ اس کے زخم اب بھر گئے تھے اور ان پر بھورے بھورے کھرنڈ آ گئے تھے۔ لاچی نے اپنے ناخنوں سے دھیرے دھیرے ان کھرنڈوں کو صاف کر دیا۔ اب اندر سفید چکنی اور لال جلد نکل آئی تھی۔ جسے دیکھ کر اس کے دل میں پھر انہیں چومنے کی خواہش بیدار نہ ہوئی۔ بلکہ ایک طرح کی نفرت اور کراہت سے اس کا دل بھر گیا۔ اور جب اس کی ماں نے اس سے پوچھا۔ یہ نشان کیسے ہیں؟

تو اس نے بڑی نفرت سے جواب دیا۔ ایک کتے کے دانتوں کے نشان ہیں۔ اس کی ماں نے اسے ایک لمحے کے لئے غور سے دیکھا اور چپ ہو کر رہ گئی۔

اگلے بیس دنوں میں لاچی نے دھار دے کے ستر روپے ادا کر دیئے۔ بھیک مانگ کے اور چوری کر کے مگر اب دن بدن اس کے لئے یارڈ سے کوئلہ چرانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اور مرغیاں

تو ہر روز پکڑی نہیں جا سکتیں۔ ریلوے کارٹروں والے بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ کیونکہ لاچی کا قصہ سارے علاقے میں مشہور ہو چکا تھا۔ جب وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف سے گزرتی تو حمیدا اس کی طرف گھور کے اپنے ساتھیوں سے کہتا۔

وہ ساڑھے تین سو کی لونڈیا جا رہی ہے۔

لاچی اگر اس پر بھی چپ رہتی تو کہتا۔

ہم سے کہو تو ہم ساڑھے تین سو کیا۔ ساڑھے تین ہزار اس کے قدموں پر لا کر پھینک دیں گے۔

اگر اس پر وہ خاموش رہتی تو وہ کہتا۔

ہماری اگر سنے تو ہم ساڑھے تین ہزار کیا۔ ساڑھے تین لاکھ اسے دلوا دیں۔ چاہیں کسی فلم میں ہیروئن بنا دیں۔ مگر اپنی ایک شرط ہے۔

اس پر تنگ آ کے لاچی اس کی طرف دیکھ کے تھوک دیتی۔ اس پر ٹیکسی ڈرائیوروں کا گروہ ٹھٹھا مار کے ہنس پڑتا۔ اور لاچی غصے میں تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے بھاگ جاتی۔ اب اس نے ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر بھیک مانگنا بند کر دیا۔ کوئی ایک دو ہوتے تو ان کی باتوں کا جواب دے دیتی۔ مگر اب معاملہ اس قدر صاف تھا۔ شرط اس قدر کھلی ہوئی تھی کہ ہر کس و ناکس اس کا مذاق اڑانے پر تل گیا تھا۔ جس سطح کی زندگی لاچی گزارنے پر مجبور تھی۔ اس سطح پر اتر کر کوئی شخص یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ لاچی اپنے آپ کو بیچنے کے لئے اتنی شدت سے انکار کرے گی۔

ارے صاحب یہ خانہ بدوش لڑکیاں۔ نہ ان کا گھر نہ گھاٹ۔ نہ ماں کا پتہ نہ باپ کا۔ کس بوتے پہ کم بخت اترا تی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے لاچی نے دماد دے کوئی شرط نہیں لگائی ہے۔ سارے علاقے کی غیرت کو چیلنج کیا ہے۔ ہر وہ شخص بھی جسے اس سے پہلے لاچی میں کسی طرح کی دلچسپی نہ تھی اب یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح لاچی اپنی شرط ہار جائے اپنی عزت کھو دے۔ دل کی بات زبان پہ

نہ آتی تھی۔ لیکن اکثریت کی عزت کا تقاضا ہی تھا کہ اس ذلیل خانہ بدوش لڑکی کی عزت چھن جائے یہ حرامزادی کیا کھا کے ہماری گھر کی عورتوں کی برابری کرنا چاہتی ہے۔

اس لئے اب بہت سے لوگ جو اس سے پہلے اس سے مذاق کیا کرتے تھے اور اپنا دل خوش کر کے اسے دو چار آنے دے دیں اب دیدہ دانستہ اسے بھیک نہ دیتے تھے کہ کی تو صاف صاف برملا اس سے کہہ دیتے۔

بہار کے بعد دیں گے۔ وہ دن تو آنے دو۔ پھر دو آنے کیا دو سو روپے لے لینا۔

لاجی خوب جلی کٹی سناتی۔ وہ خوب مزہ لیتے۔ لیکن ایک پائی بھیک اسے نہ دیتے یہ علاقہ کی عزت کا سوال تھا۔ اور عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ ہوتی ہے نا جی۔ آخر ایک گھر کی عورت میں اور ایک گلی گلی بھیک مانگنے والی۔ ٹوکریاں بُن بُن کر بیچنے والی خانہ بدوش لڑکی کی عزت میں کچھ فرق تو ہونا چاہیئے۔

ایک روز لاجی کوئلہ چُراتے چُراتے پھر عین موقع پر پکڑی گئی۔ ان دنوں یارڈ سنتری دن میں بہت چکر لگاتے تھے۔ اور خاص طور پر لاجی پر نگاہ رکھتے تھے اس لئے لاجی نے دن کو کوئلہ چرانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ رات کی تاریکی میں کوئلے کے انبار پر چھاپہ مارتی تھی۔ یہاں سینکڑوں من کوئلہ رکھا تھا۔ چند سیر اس میں اگر کوئی چُرائے گا تو کسی کا کیا بگڑ جائے گا۔ لاجی جس ماحول میں تھی اتنی سی چوری کو چوری نہ سمجھتی تھی۔ وہ دن دہاڑے کوئلہ چرالیتی۔ مگر کیا کرے۔ پولیس کے سنتریوں کی آنکھوں میں دھول جھونکے کے کیسے کوئلے کے ڈھیر تک پہنچ جائے رسک لال اسٹیشن ماسٹر نے تنگ آ کے حکم دیا تھا کہ اگر لاجی کبھی ریل کے یارڈ میں داخل ہو تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔

رات کی تاریکی میں آج جب لاجی کوئلہ چُرانے کے لئے دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور جب اس نے بہت سا کوئلہ اپنے دامن میں بھر لیا تو کسی نے آ کے اُسے پیچھے سے پکڑ لیا۔ لاجی کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے دیکھا۔ یارڈ سنتری دتو اپنے لمبے دانت نکال کر اس پر ہنس رہا تھا۔

چل اسٹیشن ماسٹر کے پاس۔

چھوڑ دے مجھے۔ لاچی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ اب کوئلہ نہ چراؤں گی۔

چلتی ہے کہ میں لات جماؤں۔ دتو نے رائفل کا ایک ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

اسے سب کیا۔ چند سیر تو کوئلہ ہے سب خانہ بدوش لڑکیاں لے جاتی ہیں۔ تیرے ریلوے کے کوارٹروں کے سارے نوکر لے جاتے ہیں۔ میں نے لے لیا تو کیا غضب کیا۔

خود اسٹیشن ماسٹر کے گھر میں یہ کوئلہ جلتا ہے۔ میں جانتی نہیں ہوں کیا۔ میں نے کون سا ایسا غضب کر دیا ہے۔ بے دتو میں کچھ نہیں جانتا۔ تجھے اسٹیشن ماسٹر کے پاس چلنا ہوگا۔ لے میں تیرا کوئلہ یہیں پھینکے دیتی ہوں۔

لاچی نے کوئلوں سے بھرا دامن وہیں ڈھیر پر الٹ دیا اب مجھے جانے دو۔

دتو نے خوف دلانے کے لیے رائفل سیدھی کی۔ بولا۔ اگر نہیں چلے گی تو ابھی گولی مار دوں گا۔

دھیرے دھیرے سر جھکائے لاچی دتو کے ساتھ چلنے لگی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ تین بجے گورنر صاحب کا اسپیشل اسٹیشن سے گزرنے والا تھا۔ اس لئے رسک لال ابھی تک گھر نہ گیا تھا۔ اسٹیشن کو سارا اسٹاف چوکس تھا اور اپنی اپنی ڈیوٹی پر کیسل کانٹے سے درست ہو کر کھڑا تھا۔ وہ ٹیلیفون پر بیٹھا جنکشن سے گورنر صاحب کی اسپیشل کے بارے میں ہدایت حاصل کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر دتو رام اور لاچی کی طرف دیکھا۔ جو آج سہمی سہمی سی ایک کونے میں کھڑی تھی اس نے ہاتھ کے اشارے سے دتو کو نکل جانے کے لئے کہا۔ دتو کمرے سے باہر نکل کے کھڑا ہو گیا۔

جب رسک لال ٹیلیفون کر چکا تو وہ دھیرے سے لاچی کی طرف مڑا۔ اور اس سے بہت سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا۔

ادھر آؤ۔

لاچی ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی بے بسی میں ایک عجیب سی کشش تھی رسک لال کا دل پگھل گیا۔ اس نے بہت نرمی سے کہا۔

تو تو بہت اچھی لڑکی ہے۔ پھر کیوں کوئلہ چراتی ہے۔

لاجی نے بڑی نرمی سے کہا۔ اسٹیشن ماسٹر صاب اب نہیں چراؤں گی۔ اب بس معاف کردو۔

مگر ایسا کام کیوں کرتی ہے۔

تم تو جانتے ہو صاب۔ سارا علاقہ جانتا ہے۔

وہی ساڑھے تین سو کا قصہ۔؟

ہاں۔

کہہ کر لاجی نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

کتنے روپے ادا کر چکی ہے۔

اتنی۔

لاجی سر سے پاؤں تک ایسی شرمائی مجوب ندامت میں ڈوبی کھڑی تھی کہ رسک لال کو اس پر بے حد پیار آیا۔ اس نے اپنی میز کے دراز کو دو ایک بار کھولا۔ بند کیا۔ کھولا پھر بند کیا۔ آخر کھول کر کچھ نوٹ نکالے۔ اور انہیں لاجی کے ہاتھ میں دے کر بولا۔

لے۔ لے جا انہیں اور دے دے اس خبیث کو۔

لاجی جیسے شکر کے بار سے دب گئی جھک گئی۔ اس نے جھک کر رسک لال کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ اور جوں ہی اوپر اٹھی وہ رسک لال کی بانہوں میں تھی رسک لال کے دبلے پتلے۔ مچھو کے ترسے چہرے پر اس نے جذبے کی لرزش دیکھی۔ وہی رنگ۔ وہی ادا وہ للچ۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رسک لال کے بھیس میں مادھولال کچھے پہیتے کو دیکھ رہی ہے۔ وہ بجلی کی چکنا ہٹ وہی رینگتے ہوئے کیڑے کی سی کلبلاہٹ۔ لاجی کے دل میں وہی کراہت آمیز نفرت پیدا ہوئی۔ رسک لال لاجی کے چہرے کی طرف جھکا ہی تھا کہ لاجی نے تڑپ کر ایک ہی جھٹکے میں رسک لال کی بانہوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ اس کے گال پر ایک زور کا طمانچہ دیا۔

کر رسک لال کرسی سے ٹھوکر کھاتا ہوا زمین پر جا گرا۔ اور زمین پر گرتے ہی شور مچانے لگا۔

پولیس! پولیس!!

دتو فوراً دوڑتا ہوا اندر آیا۔

اسے دیکھ کر رسک لال کی دلیری عود کر آئی۔ وہ زمین سے اٹھا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔ اس حرامزادی کو حوالات میں لے جا کر بند کر دو۔ یہ کم بخت کوئلہ چرائی ہے ہمارے یارڈ سے۔

لاچی فوراً ترکی بہ ترکی بولی۔ اور تم جو کچھ چرا رہے ہو مجھ سے۔ بڈھے۔ چھچھوڑس۔ شرم نہیں آتی۔ تیری بیٹی کے برابر ہوں۔ لے جاؤ۔ اسے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔ رسک لال آگ بگولا ہو کے بولا۔

لاچی آگے بڑھ کے اپنے بازو چلاتے ہوئے بولی۔ ٹھہر تو جا۔ ابھی تیری کھال نوچ لوں گی۔ لیکن دتو لاچی کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گیا۔ اور اس نے لاچی کو اسٹیشن کے حوالات میں بند کر دیا۔

ساتواں باب

تین دن حوالات میں بند رہنے کے بعد چوتھے دن حوالات کے سنتریوں نے لاچی کو اسٹیشن ماسٹر کے حکم سے حوالات کے باہر دھکیل دیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے جب لاچی حوالات کے باہر آئی تو گل اسے لینے کے لئے کھڑا تھا۔

لیکن یہ گل کوئی دوسرا گل تھا۔ اور اس پر دھول اور گرد کے نشان تھے۔ وہ پٹھان قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر سیاہ جاکٹ اور سر پر لنگی اور کلاہ اور سیاہ جیکٹ کے اوپر اس نے ایک چرمی پٹہ پہن رکھا تھا۔ جس سے بندھی ہوئی چقماق کی ایک چرخی اس کی پیٹھ پر لٹک رہی تھی۔ اور آگے پٹہ کی گرہوں میں چاقو اور چھریاں اور قینچیاں لٹک رہی تھیں۔

یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تو نے۔ لاچی نے بڑی حیرت سے پوچھا میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔

کیوں نکال دیا ہے۔

جب میں نے تیرے لئے پیسے مانگے تو آغا جی بہت خفا ہوئے۔ بولے۔ گوجی کا بیٹا ہو کر اک آوارہ خانہ بدوش لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ میں تیرے لئے ساڑھے تین سو کیا۔ تین روپے بھی نہیں دے سکتا۔ نکل جا۔ اس وقت نکل جا میرے گھر سے یہ کہہ کر وہ اپنا ڈنڈا لے کر

میرے پیچھے دوڑے میں گھر سے بھاگ آیا۔

پھر اتنے دن کہاں رہے؟ اس دن پل پر کیوں نہیں آئے کیا تھوڑے کے آ نا سوچا تھا۔ رقم اکٹھی کروں گا آ کے تیری ہتھیلی پر دھر دوں گا۔ اس کے لئے میں دو تین جگہ نوکری کرنے کی کوشش بھی کی۔ اِدھر میونسپل کمیٹی میں ایک کلرک کی اسامی خالی تھی۔ مگر وہ لوگ بولے۔ تم اِدھر کے باشندے نہیں ہو۔ تمہیں یہ نوکری نہیں مل سکتی۔ کسی نے کہا تم پٹھان ہو۔ کسی نے کہا تمہیں دیکھ کے ڈر لگتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ اس موقعے پر باندہ والے عبدالصمد تانگا نے جو ہماری برادری کا ہے۔ میری یہ مدد کی ہے۔ اس نے مجھے اس دھندے پر لگا دیا ہے۔ دو ڈھائی روپے روز ہو جاتے ہیں۔ میں نے تیرے لئے تیس روپے جمع کئے تھے۔

کہاں ہیں وہ تیس روپے۔ لاچی نے خوش ہو کے ہتھیلی آگے بڑھائی۔

گل نے سر جھکا کے کہا۔ وہ تو خرچ ہو گئے۔

خرچ کر دیئے تو نے۔ لاچی چیخ کر بولی۔

رسک لال کو دے دیئے۔ نہ دیتا تو حوالات سے تجھے باہر کیسے نکالتا۔

لاچی پلیٹ فارم کے ننگے فرش پر بیٹھ گئی۔ سامنے یارڈ کی فولادی پٹریاں بے روح سنگ دل اور جذبات سے عاری۔ ان پٹریوں سے پرے ریلوے کا جنگلا جنگلے سے پرے ریلوے کے کوارٹر تھے۔ کوارٹروں سے پرے خانہ بدوشوں کے خیمے تھے خیمے کے پرے درختوں کی ننگی قطاریں تھیں۔ وہ تیز تلواروں کی طرح ننگی شاخیں جیسے اس کی گردن پر لٹک رہی تھیں۔ جس دن ان شاخوں پہ پھول آئیں گے۔ جس دن ان شاخوں پر۔

لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ان شاخوں پر پھول نہ آئیں۔ روپوں کے سفید سفید پھول کھلیں جنہیں توڑ توڑ کر وہ وہ ماردکا دامن بھر دے۔ ان شاخوں پر آخر پھول کیوں اُگتے ہیں۔ روپے کیوں نہیں اُگتے۔ صرف ایک ہی بہار میں ایسا ہو جائے۔

لاچی دھیرے سے اُٹھی اور یارڈ سے گزرنے لگی۔ گل اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

دونوں کے قدم بے اختیار پرانے پُل کی طرف بڑھنے لگے۔ پُل کے اُوپر پہنچ کر وہ دونوں نا اُمید اور مایوس ہو کر خلا میں دیکھنے لگے۔

وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

کہیں بھی کچھ نہ تھا۔

گل نے اپنی مٹھیاں کس لیں۔ بولا۔

ابھی بہار میں بہت دن ہیں۔ میں ہولے ہولے تیرا قرضہ چکا دوں گا۔

مجھے ان ننگی شاخوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ روز صبح اُٹھ کر انھیں دیکھتی ہوں۔ کہیں ان میں سے آنکھیں تو نہیں نکل آئیں۔ کہیں ان میں کوئی پتی تو نہیں پھوٹی۔ کہیں کوئی کلی تو نہیں شرمائی۔ مجھے بہار کی آمد سے بہت ڈر لگتا ہے۔

خدا کرے بہار کبھی نہ آئے۔ گل نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔

وہ دونوں چپ ہو گئے۔

یکایک گل ہنسنے لگا۔ کیوں ہنستے ہو؟ لاجی اس کی طرف حیرانی سے دیکھ کر بولی۔

ان دنوں میں بے ایمانی کرتا ہوں۔

کیا بے ایمانی کرتے ہو۔ کوئلہ چُراتے ہو۔

نہیں۔ جب میں گھروں میں جاتا ہوں اور لوگ مجھے اپنی چھریاں چاقو تیز کرنے کے لئے دیتے ہیں تو میں انھیں صرف ایک طرف سے تیز کرتا ہوں۔

کیوں۔

تاکہ چھریاں چاقو جلد کند ہوں اور لوگ پھر میرے پاس آئیں۔

لاجی زور زور سے ہنسنے لگی۔

اسے گل کی یہ شرارت بہت پسند آئی۔ یکایک گل اسے اپنا ساتھی اپنی طرح کا محسوس ہوا۔ وہ اپنی دھن میں اس کے قریب چلی گئی۔ ہنستے ہنستے یکایک رُکی۔ بولی اپنا ہاتھ دکھاؤ۔

گل نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

لاچی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ اپنے ہاتھوں سے دبایا۔ خوش ہو کر بولی۔ ہاں کچھ فرق پڑا ہے۔

کیا فرق پڑا ہے۔ گل نے حیرت سے پوچھا۔

یہ ہاتھ نرم تھے۔ اب سخت ہو گئے ہیں۔

گل چپ رہا۔

لاچی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بولی۔

اب تمہارے چہرے پر مٹی ہے۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ بابوؤں کی طرح تمہارا چہرہ صاف اور چمکیلا نہیں رہا۔

گل نے اچنبھا کہا۔ کیا کروں میرا کام ہی ایسا ہے۔ دن بھر گھومنا پڑتا ہے۔ اب میں کل سے شیو کر کے آؤں گا۔

شیو کر کے مت آنا۔ لاچی سختی سے بولی۔ مجھے تمہارا یہ اجڑا ہوا، بڑھی ہوئی داڑھی والا چہرہ پسند ہے۔

گل کا ہاتھ لاچی کے ہاتھ میں کانپا۔ جیسے پرندہ اپنے گھونسلے میں آشیانے کے تنکے تنکے اور گھونسلے کو آرام دہ پاکر اپنے پر ڈھیلے چھوڑ کر بیٹھ جائے۔ اس طرح گل نے اپنے ہاتھ کو لاچی کے ہاتھ میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے دل میں ایک میٹھی سی لہر کہیں سے آئی۔ اور اس کی روح کے ذرے ذرے کو نغمے اور سرود سے شاداب کرتی چلی گئی۔ اور ایک سکون آمیز طمانیت سے اس کا دل سرشار ہو گیا۔ لاچی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے اس کی طرف مڑی اور گل کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

گل۔

ہاں۔

تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔

ہاں۔

مجھ سے شادی کرو گے۔

ہاں۔

مجھے ایک گھر دو گے۔

ہاں۔

تم میرے لئے بس کے کیبن میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرو گے۔

ہاں۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھتی ہو۔

بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ لاچی ایک گہری طمانیت کی آدبھ کے بولی۔ اور کچھ نہیں چاہیئے

لاچی کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کا سارا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ بے اختیار گل کے سینے سے جا لگی۔

گل نے گھبرا کر کہا۔ سارا یارڈ دیکھ رہا ہے لاچی سارا یارڈ دیکھ رہا ہے دیکھنے سارا یارڈ کیا۔ ساری دنیا دیکھے۔ میں تیری ہوں۔ لاچی نے مکمل طمانیت سے کہا اور اس کے بازو گل کے گلے میں حمائل ہو گئے۔ گل نے جھک کر لاچی کی آنکھوں کی سبز جھیلوں میں دیکھا۔ وہاں دور دور تک مسرت کے پھول کھلے تھے۔

گل نے لاچی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اور اس کے ہونٹ لاچی کے کنوارے ہونٹوں پر جھک گئے۔

پل کے نیچے ۵ ڈاؤن شور مچاتی ہوئی گڑگڑاتی ہوئی گزرنے لگی۔ اس کی سیٹی کی دلکش آواز لاچی اور گل کے دلوں میں مسرت کی گھنٹیاں بجاتی ہوئی گونجنے لگی۔ کورو۔ کورو۔ جیسے چہکتی ہوئی کوئل فضا میں لہرا کے گزر رہی ہے۔

ہری جھنڈی ہلی۔ سنگل اٹھے اور محبت میں بے بس عورت کے بازوؤں کی طرح گر گئے۔

کاٹنے والے سے کا تبادلہ۔ اور عورت کی روح اپنی پُرانی لائن کو چھوڑ کر نئی لائن پر بھاگتی چلی گئی۔ نیا سفر۔ نئی منزل۔ نئے راستے۔ ان پُوچھے۔ ان جانے راستے جو زندگی کی نئی وادیوں کو جاتے ہیں۔

اس واقعہ کے پندرہ بیس روز بعد ایک آسمانی رنگ کی پلائی متھ دمارو کے خیمے کے قریب کی سڑک پر رُکی۔ جو ائر پورٹ کو جاتی تھی اس میں سے نیم بھورے رنگ کا ریان جھلملاتا ہوا سوٹ پہنے ایک بانکا جوان نکلا۔ اس کے ہاتھ میں تھری کاسل کا ڈبہ تھا۔ اُنگلی میں بیش قیمت ہیرے کی انگوٹھی تھی۔ اور ٹائی پر بھی ایک لعل جگمگا رہا تھا۔ دمارو نے اسے جُھک کر سلام کیا۔

نوجوان نے دمارو سے پوچھا۔

ابھی اور کتنے دن مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔

بہار آجائے۔ ——— دمارو نے بڑی حسرت سے درختوں کی ننگی شاخوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بہار تو دو ماہ میں بھی نہ آئے گی۔

نہیں بابو۔ اب کے بہار جلد آئے گی۔

تب تک وہ شاید سارے پیسے چُکا دے گی۔

کیسے چُکا دے گی۔ یہ ناممکن ہے بابو۔ ان بیس دنوں میں اس نے مجھے صرف پچاس روپے دیئے ہیں۔

لیکن وہ ادا کر دے گی۔ حمید ا مجھ سے کہتا تھا۔ چاقو چھریاں تیز کرنے والا پٹھان ہر روز اسے پیسے دیتا ہے۔ وہ روز رات کو پُل پر ملتے ہیں۔

میں جانتا ہوں بابو۔

تم خاک جانتے ہو۔ وہ نوجوان جھلا کے بولا۔ سالی دو پیسے کی چھوکری، اور اتنی اکڑ فوں۔ تُم سے کچھ نہیں ہوتا تو مجھ سے صاف کہہ دو۔ سالی پر غنڈے چھوڑ دوں گا۔ دو منٹ میں اسے اغوا کر کے میرے پاس پہنچا دیں گے۔ ذرا تو بات ہے۔

اب دیر بھی ذرا سی ہے بابو۔ دمارو لجاجت سے بولا۔ بہار کو آنے دو۔ یہ شگوفہ خود بخود کھل جائے گا۔

بس باتیں ہی باتیں ہیں تمھاری۔ نوجوان چیں بہ جبیں ہو کر بولا۔ اور اپنی کار کی طرف جانے کے لئے مڑا۔ کہ دمارو نے آگے بڑھ کر اس سے بھکاریوں ایسے لہجے میں کہا۔

ایک سو روپے دے جاؤ۔

اب تک چار سو روپے مجھ سے تم لے چکے ہو۔

بس ایک سو اور دے دو۔ پھر بہار آنے تک کبھی نہ مانگوں گا۔

صرف ایک سو روپیہ۔

نوجوان نے اپنا بڑا چرمی بٹوا کھولا۔ اس میں سو سو کے نوٹ ہزاروں ہوں گے۔ دمارو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ نوجوان نے بہت بے پروائی سے اس میں سے ایک نوٹ نکال کے اس کے ہاتھ میں دیا۔ دمارو گھٹنوں تک بار احسان سے جھک گیا۔ دمارو کے فرشی سلاموں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور بہت نخوت سے سگریٹ پیتا ہوا اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔

دمارو جب سو کا نوٹ لے کر خوشی خوشی اپنے خیمے کو گھوما تو اس نے اپنے سامنے رگی کو کھڑا پایا۔ رگی کی آنکھوں میں شریر مسکراہٹ تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ دمارو نے اسے دیکھ کر جلدی سے سو روپے کا نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اور رگی سے نگاہیں چرا کر اپنے خیمے کو جانے لگا۔ کہ رگی نے اس کا راستہ روک لیا۔

کیا ہے۔ دمارو نے بڑے غصے میں کہا۔

یہ کون تھا؟

چمن بھائی تھا۔ کرلا روڈ پر اس کا پلاسٹک کا کارخانہ ہے۔ اس نے تمھیں سو روپے کا نوٹ کیوں دیا۔

یہ میرا معاملہ ہے۔ تم بیچ میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟

میں سب سمجھتا ہوں - میں نے سب سُن لیا ہے - اب میرا حصّہ نکالو - میری بیٹی کا سودا کرنے والے تم کون ہوتے ہو رگّی نے دمارد کا گریبان پکڑ لیا -

ارے چلا مت دمارد نے بہت چالاکی سے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا - میں تمہیں حصّہ بھی دیتا ہوں اور حصّہ سے بھی زیادہ دیتا ہوں -

تو دو -

میرا گریبان تو چھوڑ دو -

رگّی نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا -

دمارد نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے ایک دس کا نوٹ نکالا - بولا یہ لو دس روپے - اور دس روپے اور دوں گا - اگر تم میرا ایک کام کر دو گے -

کیا کام ہے -

دمارد نے غور سے رگّی کی طرف دیکھا - پھر کہا -

کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی ہمارے قبیلے ہی میں رہے -

ہاں -

وہ کسی ایک گاؤں - کسی ایک شہر کسی ایک مرد کی ہو کر نہ رہے -

ہاں -

تو تمہیں میرا کام کرنا ہوگا - میں تمہیں اس کے دس روپے دوں گا -

وہ کام کیا ہے - پہلے یہ تو بتاؤ ؟

ادھر میرے قریب آؤ -

رگّی دمارد کے قریب گیا - دمارد نے جھک کر رگّی کے کان میں کچھ کہا - کچھ دیر تک رگّی کا چہرہ دمارد کی بات سُن کر پریشان اور متوحش رہا - پھر یکایک اس کا چہرہ صاف اور روشن ہوگیا - اور اس نے دمارد سے کہا -

اس کام کے تیس روپے ہوں گے۔

تیس بہت زیادہ ہیں۔ میں پندرہ دے دوں گا۔

پندرہ نہیں لوں گا۔ پچیس لوں گا۔

بڑی ردوکد کے بعد پچیس پر سودا ہوگیا۔

رگی نے کہا۔ نکالو پچیس روپے۔

ابھی نہیں۔ دیارو ہنس کے بولا۔ میرے یار اپنا کام کرو پچیس روپے لے جاؤ۔ اگر میرا اعتبار نہ ہو تو کھوا من کے پاس رکھوا دوں۔

نہیں۔ ما من حرامزادے سے تم حرامزادے بہتر ہو۔

رگی نے مسکرا کر کہا۔ اور دس روپوں کو جیب میں ڈال کر گنگناتا ہوا چلا گیا۔

آج لاچی نے صرف بارہ آنے کمائے تھے۔ سوا روپیہ گل نے لا کے دیا تھا۔ اس طرح دو دو روپے کر کے کتنے مہینوں میں قرضہ چکایا جا سکے گا۔ لاچی بار بار خائف ہو کر درختوں کی طرف دیکھتی۔ درختوں کی چھال کا رنگ بدل رہا تھا۔ بھورے بھورے ڈالوں پر ہری ہری کچکیں شاخیں پھوٹ چکی تھیں۔ چند دنوں میں ان پر نرم نرم سبز پتیاں پھوٹیں گی۔ پھر سبز پتیوں کے سرے ہوئے جھومر میں لال لال شگوفے پھوٹیں گے۔ اور گویا میری قسمت پھوٹ جائے گی۔

لاچی کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

گل نے اسے ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔

گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں وقت سے پہلے روپیہ چکا دوں گا۔

دن رات محنت کرتا ہوں۔ ایک فلم اسٹوڈیو میں دربان کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ مالک نے مجھے بلایا ہے۔ پچھتر روپے تنخواہ ہوگی۔ شام کے چھ بجے چھٹی ہوگی۔ چھٹی ہوتے ہی میں چقماق کی برچی لے کر گھومنا شروع کر دوں گا۔ کچھ یہاں سے آئے کچھ وہاں سے آئے گا۔ روپے آ جائیں

سے قرضہ چک جائے گا۔

لاچی کی بشاشت واپس آ گئی۔ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

پھر۔ پھر۔

پھر ہم اپنا گھر بسا لیں گے۔ باندرہ والے عبدالصمد خان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ مجھے باندرہ میں ایک کھولی دلا دے گا۔ ہم دونوں اس میں رہیں گے۔

ہم دونوں! لاچی جیسے خوشی سے چیخ کر بولی۔ میرا گھر۔

مگر چھوٹا سا گھر ہو گا ـــــ ہائے میرا گھر۔

لاچی ایک دم گل کے سینے سے لگ کر بولی۔ اس کا ننھا سا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا۔

ہائے جب تو سچ مچ بیاہ کر آ جائے گی۔ سچ مچ بیاہ کر آ جائے گی۔

گل نے لاچی کو اپنی بانہوں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

اچھا تو میں جاؤں۔ رات کو پل پر آؤں گا۔

لاچی آزردہ ہو کر بولی۔ تم ہر روز یہاں سے پیدل باندرے جاتے ہو۔ وہاں سے پیدل رات کو پل پر واپس آتے ہو۔ صرف مجھے دیکھنے کے لئے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔

لاچی نے اپنی جیب ٹٹول کر اس میں سے چار آنے نکالے۔ اور گل کو دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

بس کا کرایہ۔ تم نے جانے کا تو لے جاؤ!۔

نہیں لاچی۔ گل نے بہت نرمی سے کہا۔ تم چار آنے بھی دماں کو دے دو۔ قرضے میں سے چار آنے اور کم ہو جائیں گے۔ یہ تو سوچو۔

لیکن تم کتنے تھک جاتے ہو۔

گل ہنس کر بولا۔ جب تم میرے گھر آ جاؤ گی پھر تم میرے پاؤں دبا دیا کرنا۔ میری ساری تھکن دور ہو جائے گی۔

پھر میں تمھارے پاؤں دباؤں گی ٹانگیں دباؤں گی۔ تمھاری پیٹھ۔ تمھاری کمر۔ تمھارے ہاتھ تمھاری گردن تمھارا سر دباؤں گی۔ تمھارے جسم کے گوشے گوشے سے ساری تھکن اپنی بانہوں میں لے لوں گی۔ میرے گل۔ میرے گل۔ لاچی نے گل کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے سینے پر جھکا لیا۔ گل نے لاچی کو پیار کیا۔ پھر اس نے چار آنے لاچی کی جیب میں ڈال دیئے۔ اور رات کو پل پر آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

آٹھواں باب

ان دنوں لاچی رامن اور اپنی ماں سے زیادہ باتیں نہ کرتی تھی۔ اسنے قریبی رشتے میں اجنبیوں کا سا رکھ رکھاؤ آ گیا تھا۔ کم سے کم باتیں ہوتی تھیں اور غیریت کے پردے میں ہوتی تھیں۔ لاچی اپنے خیمے میں پہنچی تھی اور پیٹھے رہی رامن اور اپنی ماں کے لئے کھانا پکاتی تھی۔ برتن صاف کرتی۔ خود کھانا کھاتی۔ پر جب سونے کا وقت آتا چٹائی لے کر خیمے کے اندر سو جاتی۔ رات دو بجے تک یا تو جاگتی رہتی یا اگر سو جاتی تو رات کے دو بجے خود بخود اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ بھاگ کر پل پہنچتی۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ دور ہی سے اس نے دیکھ لیا کہ پل پر رات کی تاریکی میں ایک دھندلا دھندلا سا سایہ کھڑا ہے۔ محبت اور شوق سے اس کے قدم تیز ہو گئے۔ اور وہ جلدی جلدی پل کے اوپر پہنچی۔ لیکن وہاں پہنچ کر جب وہ سایہ اس کی طرف مڑا تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ یہ گل نہ تھا۔

دُبلے پتلے بدن والا نوکیلے گالوں والا۔ چھوٹے ناٹے قد کا۔ سامنے والا رامو تھا۔

رامو! لاچی زور سے چلائی۔ تم یہاں کیسے۔ پھر اک دم گھبرا کے بولی۔

گل کہاں ہے۔

ہسپتال میں ہے۔

رامو رکتے رکتے بولا۔

ہسپتال میں! لاچی حیرت سے بولی۔ پھر اس کی زبان خود بخود بند ہو گئی۔ وہ آگے کچھ نہ بول

سکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے راموکو دیکھنے لگی۔

راموآہستہ سے بولا۔

وہ یہاں سے باندرے پیدل جا رہا تھا۔ ارلا کے موڑ پر جہاں سڑک کے کنارے کنارے بڑے آدمیوں کے بنگلے ہیں۔ اور بہت بڑے بڑے جھاڑ ہیں۔ ادھر سے ایک آدمی نکلا اور اس نے پیچھے سے آکے چھراگل کی پیٹھ میں بھونک دیا۔

ہائے! لاچی نے اپنا ہاتھ اپنے منھ پر رکھ لیا۔

گل نے اسے پکڑنا چاہا۔ مگر رات کی تاریکی میں وہ آدمی اپنا دامن چھڑا کر بھاگ کر درختوں میں گم ہو گیا۔ گل خون میں لت پت سڑک پر لوٹنے لگا۔ اتفاق سے میں اسی وقت اپنے گھر جا رہا تھا۔ میں ارلا میں رہتا ہوں نا۔ جھونپڑیوں میں جدھر بجلی والوں کا دفتر ہے اس کے پیچھے۔ میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ کہ راستے میں کسی کے کراہنے کی آواز سنی۔ پلٹ کے دیکھا تو گل تھا۔

زمین پر لوٹ رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ راستے میں گزرتی ہوئی ایک لاری کو روکا۔ اور اب اسے باندرے کے ہسپتال میں پہنچا کے ادھر تمھاری طرف آیا ہوں۔ مجھ سے گل نے کہا تھا۔ تو مجھے یہاں ملے گی۔

لاچی نے گھبرا کے پوچھا۔ اس کا کیا حال ہے۔

راموبولا۔ اس کے جسم سے خون تو بہت گیا ہے۔ مگر ڈاکٹر بولتے تھے۔ وہ بچ جائے گا۔

تو مجھے جلدی ہسپتال لے چل!

راموتھوڑی دیر کے لئے جھجکا۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور اس میں سے پندرہ روپے نکالے۔ اور انھیں لاچی کو دیتے ہوئے بولا۔ انھیں اپنے پاس رکھ لے!

کاہے کے لئے۔ لاچی حیران ہو کے بولی۔

رامونے سر جھکا کے کہا۔ مجھے تیرا قصہ معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں محبت کیا ہوتی ہے۔ میری بھی ایک لڑکی تھی۔ تیری اتنی بڑی۔ ایک دن رسک لال نے اس کی محبت لے لی تھی۔ وہ

چُپ ہو گیا۔

دیر تک چُپ رہا۔ پھر رُندھے ہوئے گلے سے بولا۔ اگر میں کچھ کرتا تو میری نوکری جاتی تھی۔

وہ پھر چُپ ہو گیا۔ پھر آہستہ سے۔ بہت دھیرے سے بولا میں جانتا ہوں محبت کیا ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ شرم سے جیسے زمین میں گڑ گیا۔

نہیں نہیں میں یہ روپے نہیں لوں گی۔ لاچی آبدیدہ ہو کر بولی۔ تیری لڑکی کہاں ہے۔ کنوئیں میں ڈوب کر مر گئی۔ رامو مُنہ پھیر کر خلا میں دیکھنے لگا۔

لاچی دم بخود رہ گئی۔ کتنا بڑا خلا ہے۔ اس دُنیا میں۔ کتنا بڑا کنواں۔ کتنا گہرا۔ کتنا سیاہ۔ کتنا اندھا ہے یہ دُنیا کا کنواں! ہر روز ہزاروں عورتیں اس میں ڈوب کر مر جاتی ہیں اور پھر بھی یہ بھوسا کا کنواں نہیں بھرتا۔

یکایک رامو نے لاچی کا دامن پکڑ کر کہا۔

میں تجھے اگلے مہینے کی تنخواہ پر دس روپے اور دوں گا۔ مگر دیکھنا۔ کبھی بھی اپنی محبت نہ بیچنا!

لاچی کا دل چاہا کہ وہ بڈھے رامو کے شانے پر سر رکھ دے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اسے بابو بابو کہہ کر پکارے۔ لیکن اس نے بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو پی لیا اور آہستہ سے بولی۔ مجھے ہسپتال لے چلو۔

گل کو ہسپتال میں ڈیڑھ ماہ کے قریب رہنا پڑا۔ دھیرے دھیرے اس کا زخم مندمل ہوتا گیا دھیرے دھیرے اس کے دل کا زخم کھلتا گیا۔ وہ ہر لحظہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا۔ دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ہر لحظہ بہار قریب آتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ بستر پر پڑا تھا۔ لاچی ہر روز ہسپتال آتی۔ دونوں وقت جب ہسپتال تیمار داروں کے لئے کھلتا تھا۔ اور اس کے لئے اپنی کمائی میں سے پھل خرید کے لاتی تھی۔

اس نے سبزی مارکیٹ میں سبزی بیچنے والی ایک بڑھیا کے ہاں نوکری کر لی تھی۔ بڑھی کمزور ہو چکی تھی۔ اور اب اس سے سبزی کی ٹوکری سر پر اٹھائے گلی گلی گھوما نہ جاتا تھا۔ لیکن اس کے گنے بندھے گاہک تھے جو اسی سے سبزی خریدنا پسند کرتے تھے۔ اور بڈھی کا گھر بھی اسی سبزی بیچنے سے چلتا تھا۔ اور پھر اس کے گاہک اسے وقت پر پیسہ دیتے تھے۔ اس لئے اس نے لاچی کو اپنے ہاں نوکر رکھ لیا۔ اور ہر روز اپنی آمدنی میں سے ایک تہائی اسے دینے لگی۔ اسی کاروبار سے لاچی کو ہر روز سوا روپیہ ڈیڑھ روپیہ مل جاتا تھا۔ مگر اتنے سے تو گل کے لئے پھل ہی آ جاتے تھے دارو کو دینے کے لئے کچھ نہ بچتا تھا۔ کبھی کبھی تو بس کے آنے جانے کا کرایہ بھی بھاری پڑ جاتا۔ اس وقت لاچی بھی وہی کرتی جو گل کا شیوہ تھا۔ کیوں کہ شیوہ عاشقی میں مرد اور عورت کی تفریق کہاں! اپنے محبوب کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

لاچی کو اس کاروبار عشق میں ایک نئی لذت محسوس ہوئی۔ گل جب تندرست تھا کبھی لاچی کو اتنا اچھا نہ لگا جتنا بیمار ہو کر۔ اب ہر لحظہ وہ یہی چاہتی تھی کہ ہر وقت اپنے بیمار محبوب کے قدموں میں بیٹھی رہا کرے مگر ہسپتال کے بھی قانون اور قاعدے ہوتے ہیں۔ گو لاچی کی دلربا صورت دیکھ کر ڈاکٹر اردلیوں کو رحم آ جاتا تھا۔ کیا وارڈر اور ڈاکٹر لوگ بھی اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ جب وہ آتی تو وارڈر بھی پیچھے پیچھے سے جاتے۔ ڈاکٹر وارڈ میں دو تین بار چکر لگایا۔ اور کبھی ڈیوٹی ڈاکٹر کے ساتھ تین چار ڈاکٹر اور بھی آ جاتے۔ بظاہر وہ کوئی دلچسپ کیس دیکھنے آتے تھے۔ لیکن ہسپتال کی نرسوں کو بخوبی معلوم تھا کہ اصلی دلچسپی کہاں پر مرکوز ہے۔ اس لئے ہسپتال کی نرسیں لاچی سے بہت جلتی تھیں اگر ڈاکٹر ادھر ادھر کہیں موجود ہوتا تو لاچی کو اور تمام بیٹھنے دیتیں۔ لیکن ڈاکٹر کے دور ہوتے ہی اسے تحکمانہ انداز میں وارڈ سے باہر چلے جانے کا حکم دیتیں۔ لاچی سب سمجھتی تھی۔ کس کس ہمدردی کے پس پردہ کون سا جذبہ جھانک رہا ہے۔ کس کے نفرت انگیز سلوک کے پیچھے کون سی جلن پنہاں ہے وہ سب سمجھتی تھی۔ اس لئے برداشت کر لیتی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی گرم لاوا ایسی طبیعت پر جبر کرنا اور جبر کر کے ایک معاف کر دینے والی مسکراہٹ سے کام لینا سیکھ لیا تھا۔ کیوں کہ جب انسان کسی جذبے کی ماہیت اچھی طرح سے سمجھ لے تو برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

اسی اثنا میں ایک دن بلوچی۔ گل کا باپ صبح سویرے لاچی کے خیمے پر پہنچا۔ جب لاچی سبزی مارکیٹ میں کام پر جانے والی تھی۔ لاچی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

بلوچی بولا۔ مجھے تم سے کچھ کام ہے۔

لاچی نے کہا۔ مجھے فوراً ہی سبزی مارکیٹ پہنچنا ہے اس وقت رک نہیں سکتی۔

بلوچی نے کہا۔ چلتے چلتے باتیں کرلیں گے۔

لاچی چلتی رہی۔ بلوچی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ لاچی اس کی باتیں سننے کے لئے لمبے راستے سے ہولی۔ جو یارڈ کے باہر گھاس کے گٹھوں کے گودام اور کولا روڈ کو جانے والی بسوں کے شیڈ کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ جہاں قریب میں ایک سینما پڑتا تھا اور سینما کے عین سامنے ریلوے کا کراسنگ تھا۔

دونوں نے چلتے چلتے خاموشی سے آدھا راستہ طے کرلیا۔

آخر لاچی بولی۔ تم کچھ بات کرنے آئے تھے۔

تم گل کو چھوڑ دو۔ یکا یک بلوچی کے منہ سے نکلا۔

کیوں چھوڑ دوں۔

وہ میرا بیٹا ہے۔ بلوچی تحکمانہ انداز میں بولا۔

وہ میرا پیارا ہے۔ لاچی بڑی نرمی سے سر جھکا کے بولی۔

اگر تم اس سے شادی کروگی تو ساری برادری مجھ پر تھوتھو کرے گی۔

ایک برادری میری بھی ہے۔

تم خانہ بدوشوں کا کیا اعتبار۔ آج یہاں کل وہاں۔ تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو میرا بیٹا تمہیں بھول جائے گا۔

لاچی خاموشی سے چلتی رہی۔

بلوچی نے اپنے جیب سے ساڑھے تین سو روپے نکالے۔

یہ لے لو۔ اور میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔

نہیں نہیں۔ لاچی بڑی تیزی سے بولی اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔

پچاس اور دیتا ہوں۔ بلوچی نے پچاس روپے اور نکالے نوٹوں کی گڈی ہاتھ میں کانپ رہی تھی۔

لاچی نے اُن نوٹوں کی طرف دیکھا نہیں۔ اور ہاتھ سے جھٹک کے آگے بڑھ گئی۔

بلوچی نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے روک لیا۔

سنو سنو! وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔

تم سے شادی۔ لاچی ہکا بکا رہ گئی۔

ہاں! میں! میں تمھیں خوش رکھ سکوں گا۔ گُل کی صحت دیکھو اور میری صحت دیکھو۔ بلوچی اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔ میں تمھیں خوش رکھ سکوں گا۔ میرے پاس روپیہ بھی ہے۔ بہت سارا روپیہ۔ اور جب سے ہسپتال میں۔ میں نے تمھیں دیکھا ہے میں پاگل ہو گیا ہوں۔

یکایک لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔

ہنسی اُسے بے اختیار آرہی تھی۔

کیوں ہنستی ہو۔ بلوچی برافروختہ ہو کے بولا۔

اس لئے ہنستی ہوں کہ میں باپ اور بیٹے میں سے صرف ایک کے ساتھ شادی کر سکتی ہوں۔

تو مجھ سے شادی کر لو۔ بلوچی بہت بے تابی سے بولا۔ میں حق مہر کے لئے پانچ ہزار روپے رکھنے کے لئے تیار ہوں۔

بے قرار ہو کر بلوچی نے لاچی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

لاچی نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور گہرے طنز آمیز لہجے میں بولی۔ تم اپنے بیٹے کی رضامندی مجھے لے دو۔ پھر میں تم سے کیا تیرے دادا سے بھی شادی کر لوں گی۔

یہ کہہ کر لاچی بہت تیزی سے اس کے پاس سے گھومی۔ اور دوڑ کر ریلوے کراسنگ پر تلا نہیں

بھرتی ہوئی نکل گئی۔

سالی۔ بلوچی نے دانت پیس کر کہا۔ بگڑ بر گشتہ نہ بگڑ دادوں تو احمد یار خاں نام نہیں۔

لاچی نے سن لیا۔ اور وہیں کرا سنگ سے پلٹ کر بلند آواز میں بولی۔ پہلے برادری سے پوچھ لینا خان!

پھر وہ ہنستی ہوئی سبزی مارکیٹ کی طرف چلی گئی۔

اسے بلوچی کی باتوں میں بے حد مزہ آیا تھا۔ آج وہ دن بھر ان باتوں کو یاد کر کے سبزی کا بوجھ اُٹھائے گھومنے لگی۔ یہ پچاس برس کے بعد لوگ کتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ رسک لال ہوں یا احمد یار خاں ان کی ایک ہی رگ ہے۔ زبان پر پند و نصائح کے دفتر ننگا ہوں میں وہی بے بس لالچی حرص! وہی پیاری سی مجبوری۔ بڈھے ہو کر مرد کتنے دلچسپ ہو جاتے ہیں میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ لاچی نے سوچا۔ ورنہ میں ضرور ان پر ایک کتاب لکھتی۔

"میری گلی کے بڈھے"

شام کو جب لاچی ہسپتال میں گل سے ملنے گئی تو اس نے گل سے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس روز بلوچی بھی اپنے بیٹے کو دیکھنے نہ آیا۔ اس کے بعد بھی کئی دن تک نہ آیا۔ پھر ایک روز پتہ چلا کہ بلوچی اپنی بیٹھک بند کر کے پونا چلا گیا ہے۔ اور اس نے اب وہاں سے اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے۔

نواں باب

ڈیڑھ ماہ کے عرصہ کے بعد جب لاچی گل کو ہسپتال سے لے کے آئی تو خانہ بدوشوں کے خیموں کی قطاروں کے باہر درختوں کی قطار پر پتیاں پھوٹی ہوئی تھیں۔ اور ان میں نرم نرم اور نوخیز کلیاں جھانک رہی تھیں۔ دلدار نے ان کلیوں کو بہت غور سے دیکھا۔

دو دن میں یہ کلیاں شگوفے بن جائیں گی۔ پھر میری زندگی میں بہار آ جائے گی۔ اب تو ایک رات کی بات ہے یا شاید دو رات کی بات ہے۔

ان کلیوں کو آگ لگ جائے گی۔ لاچی اپنے منہ سے شعلے اگلتے ہوئے بولی۔ یہ شگوفے کبھی نہ کھلیں گے۔ اور کھلیں گے تو انگارے بن کر تیرا منہ جھلس دیں گے۔

دلدار زور سے ہنسا۔

لاچی وہاں سے بھاگ گئی۔

ان سُندر سُندر اُٹھتی ہوئی کلیوں کا نوخیز جوبن اسے کھائے جا رہا تھا۔

رات کو وہ دونوں پھر اسی پرانے پل پر تھے۔ وہ اور گل! آج آسمان تاریک تھا۔ یہی تاریکی اس کے دلوں پر بھی مسلط تھی۔ رہ رہ کر آسمان پر بجلی کوندتی تھی۔ لیکن ان کے دل میں کسی طرح کی روشنی نہ تھی۔

گل نے آہ بھر کے کہا۔ اب تم کیا کرو گی۔

لاچی سیدھے سپاٹ لہجے میں بولی۔ ہم ہار گئے۔ وعدہ وعدہ ہے۔

یہ بے ایمانی اور بداخلاقی کا وعدہ ہے لاچی۔ تم اسے پورا نہیں کرو گی۔

خانہ بدوش لڑکی اپنی زبان سے نہیں پھرتی۔ لاچی نے سر جھکا کے جواب دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔ گل نے پُرامید لہجے میں کہا۔ تم میرے ساتھ چلو گی لاچی! یہ دُنیا بہت وسیع ہے ہم کسی دوسرے شہر میں پناہ لیں گے۔ اپنا چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔

گھر۔

لاچی جیسے سسکنے لگی۔ گل نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

ہاں یہی تو گھر ہے! لاچی نے ایک بار اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے دل سے کہا۔ انہیں باہوں میں تو میرا گھر ہے۔ یہیں سکون ہے۔ یہیں آرام ہے۔ یہیں میرا مستقبل ہے۔ یہیں پھول کھلتے ہیں۔ یہیں کوئی شب و روز کسی کا انتظار کرتا ہے۔ گل گل۔ میں مر جاؤں گی مگر اپنے وعدے سے نہیں پھروں گی۔

یکایک لاچی اس کی باہوں سے نکل گئی اور پل کی ریلنگ پر جھک کر رونے لگی۔ ٹپ ٹپ اس کے آنسو نیچے ریل کی فولادی پٹریوں پر گرنے لگے۔ لیکن آنسوؤں نے فولاد کو کب گلایا ہے۔

گل کی خالی باہیں گر گئیں۔ بے بس اور مجبور ہو کر اس نے پل کی ریلنگ کو ٹھوکر ماری اور بولا۔ یہ بے کار۔ بے ہنگم دقیانوسی پل یہاں کھڑا ہے۔ یہ پل جو کہیں جاتا نہیں۔ کسی کو کسی سے ملاتا نہیں یہ ظالم پل ٹوٹ کیوں نہیں جاتا۔

ٹھوکر کھا کر ریلنگ کی آہنی سلاخیں زور سے جھنجھنا اٹھیں اور ان کی گونج دیر تک فضا میں قہقہے لگاتی رہی۔ جیسے کوئی ان دونوں پر ہنس رہا ہو۔

یہ پل ہماری محبت کی طرح ہے جو کہیں نہیں جاتی۔ لاچی کے دل کی گہرائیوں سے جیسے دھواں نکلا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گل نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے اسے چپ نہیں

گرایا۔ اس نے لاچی کو روسنے دیا۔ اس کے بازو بے کار تھے۔ اس کا سارا جسم شل تھا۔ وہ نہ سوچ سکتا تھا۔ چپ چاپ لاچی کے قریب ایک بت کی طرح کھڑا تھا۔ ہوتے ہوتے لاچی کے آنسو تھم گئے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ اپنے گیلے رخساروں کو اوڑھنی سے صاف کیا پھر زمین سے سے پلٹ کر سر جھکاتے ہوئے اس نے گل سے کہا۔

اب میں جاؤں۔

کہاں۔

جہاں کی میں ہوں۔ جو میرا قبیلہ ہے۔ جو میرے رسم و رواج ہیں۔ جو جب سے دُنیا بنی ہے جب سے چلے آئے ہیں۔

گل نے رُندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔ اب میں کہاں جاؤں یہ تو بتاتی جاؤ۔

لاچی کے گلے سے ایک چیخ نکلی۔ لیکن اس نے اسے حلق ہی میں دبا یا۔ مار دیا۔ گھونٹ دیا۔ کتنی ہی اچھی چیزوں کا۔ اچھے جذبوں کا۔ اچھی آرزوں اور تمناؤں کا قتل کرنا پڑتا ہے۔ جب جا کر ایک وعدہ پورا ہوتا ہے۔ وہ چپ کھڑی رہ گئی۔

آسمان تاریک۔ زمین تاریک۔ پٹریاں سیاہ۔ یارڈ بے حس سگنل کی بتیاں کانچ کی نتلی آنکھوں کی طرح پلک جھپکائے بغیر ان دونوں کی طرف تک رہی تھیں۔

آؤ آخری بار مجھے پیار کر لو!

لاچی نے سسکتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں تھے۔ جب کوئی ان کے قریب آکر کھنکارا۔ گل نے لاچی کو اپنے بازوؤں سے الگ کئے بغیر ذرا مڑ کے دیکھا۔ راموتھا۔

راموں نے آہستہ سے کہا۔

اسٹیشن پر تم دونوں کو بلایا ہے۔

پلیٹ فارم پر تھرڈ کلاس کے خالی یارڈ کے باہر پانچ خانوں کی اوٹ بہت سے لوگ جمع

تھے اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے تھے۔ گل نے دل ہی دل میں سوال کیا۔ اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ نہ کوئی گاڑی آتی ہے نہ جاتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ڈیوٹی کا اسٹیشن ماسٹر اپنے کمرے میں ایک کرسی سے دوسری کرسی لگائے سو رہا تھا۔ یہ لوگ یہاں آ کر کیا کر رہے ہیں۔

مگر ان لوگوں میں کوئی مسافر نہ تھا۔ سبھی دن رات ریلوے پر کام کرنے والے لوگ تھے۔ قلی اور یارڈ مین۔ مستری اور کانٹے والے۔

گھنٹی بجانے والے۔ پانی پلانے والے۔

رامو نے کہا۔

ان لوگوں نے تمہاری کہانی سنی ہے۔ یہ لوگ تمہاری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں۔

پانی پلانے والے ماتا دین نے اپنے نیفے میں اڑسے ہوئے دو نوٹ نکالے۔ ایک پانچ روپے کا نوٹ تھا۔ ایک ایک روپے کے دو نوٹ تھے۔ پھر اس نے اپنی جیب میں سے ایک اٹھنی نکالی۔ ساڑھے سات روپے اس نے لاجی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ادھیڑ عمر کے داؤد نے اپنی کھچڑی سی داڑھی کھجائی پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پچیس روپے لاجی کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ روپے دے کر وہ کچھ نہیں بولا۔ سر جھکا کر آہستہ سے پیچھے ہٹ گیا۔

کالا بھجنگ لیمن مستری اپنے سفید سفید دانت نکالے ہوئے آگے بڑھا۔ اس نے چالیس روپے لاجی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

گھنٹی بجانے والا ڈی سوزا آگے بڑھا۔ اس نے دس روپے نو آنے دیئے۔

ایک منحنا سا قلی جس کے سر پر کشادہ پگڑی تھی۔ اور جس کی چھاتی پر اب تک ۲۰۹ کا پیتل کا بلا چمک رہا تھا۔ جو سب سے آگے بڑھا اور بولا۔ ہم قلیوں نے چندہ کر کے ایک سو پچیس ۱۲۵ روپے جمع کئے ہیں۔ اور سارے روپے اس بڈھے قلی نے لاجی کی اوڑھنی میں ڈال دیئے۔ دو چار۔ پانچ کر کے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ لاجی کی اوڑھنی روپوں اور سکوں سے بھاری ہو گئی۔ اور وہ فرط احسان سے

جھکتی گئی۔

پھر یکایک سب اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔

کوئی کچھ نہ بولا۔

رامو نے آگے بڑھ کے کہا۔ ہم لوگ غریب ہیں۔ ہمارے جیتے جی تیری کوئی عزت نہ لے گا۔ جا اپنے سردار کو یہ روپیہ واپس کر دے۔

لاچی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ یکایک اس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے روشن ہو گئیں۔ اس نے لپک کر رامو کا ہاتھ چوم لیا۔ اور داؤد کا بڈھے تلی کا وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ اور سب کو دُعائیں دینے لگی۔ کیسے مُسکراتے ہوئے چہرے تھے۔ کیسی روشن نگاہیں تھیں۔ گل حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے کوئی فرشتہ نہ تھا۔ سبھی انسان تھے خطاؤں کے پُتلے۔ خامیوں سے بھرپور۔ لیکن یہ کیسا نور تھا جو اس وقت ان کے بدن کے ذرّے ذرّے سے پھوٹ رہا تھا۔ کون کہتا ہے آسمان تاریک ہے۔ کون کہتا ہے زمین بنجر ہے کون کہتا ہے یہ پتھر کہیں نہیں جاتی۔ یہ سنگ یوں ہی چمکتے ہیں۔ ہواؤں میں یہ کیسی خوشبو ہے۔ کانوں میں یہ کیسی راگنی ہے۔ کلیو! مُسکراؤ۔ شگوفو کھل جاؤ۔ بہارو آ جاؤ۔ آج انسان نے اپنا قرض چکا دیا ہے۔

بوڑھے تُلی نے اپنی بھنوؤں کے نیچے سے ایک آنسو پونچھا آگے بڑھ کے اس نے لاچی کا ہاتھ گل کے ہاتھ میں دیا اور بولا اسے گھر تک چھوڑ آؤ۔

گل اور لاچی ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

گل نے ایک گہری سانس لی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔ خدا کرے کل بہار آ جائے۔

گل سے رخصت ہونے کے بعد لاچی پہلے تو سیدھی اپنے خیمے کو چلی پھر کچھ سوچ کر تیزی سے پلٹی اور دمارو کے خیمے تک پہنچی۔ وہاں پہنچ کر دمارو کو زور زور سے آواز دینے لگی۔

دمارو۔

دمارو۔

لیکن دمارد نہ بولا۔

لاچی نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔

خیمے میں دمارد نہ تھا۔ صرف جاماں سو رہی تھی۔ لاچی نے پیر کی ٹھوکر مار کر جاماں کو جگا دیا۔

جاماں ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھی۔ اور لاچی کو دیکھ کر حیرت سے بولی۔

کیا ہے۔ اس وقت۔ تم یہاں۔

دمارد کہاں ہے۔ لاچی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

شام سے غائب ہے۔ جاماں آنکھیں ملتے ہوئے بولی۔ کیا کام ہے۔

کہاں گیا ہے۔ لاچی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے پھر پوچھا۔

پلاسٹک کے کارخانے والے سیٹھ نے بلوایا تھا۔ شام ہی سے چلا گیا تھا ابھی تک نہیں آیا۔

گنگناتے ہوئے لاچی وہاں سے پلٹی۔ پلٹ کر ٹیلے کے پیچھے چلی گئی۔ جہاں ٹیلے کے تاریک سائے میں گُل کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

روپے دے آئی۔ گُل نے بہت بے چینی سے پوچھا۔

لاچی نے اسے بھری ہوئی اوڑھنی دکھا کر کہا۔

کم بخت ملا ہی نہیں۔ اب صبح ہی دوں گی۔

اب تم مجھے کب ملوگی۔

صبح قرضہ چکاتے ہی تمہارے پاس آجاؤں گی۔ اسی پرانے پُل پر تم میرا انتظار کرنا۔

بہت اچھا۔

گُل اطمینان سے رخصت ہوا۔ لاچی دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے خیمے میں داخل ہوئی۔ مامن نے ہلکی سی کروٹ لی لیکن پھر مدہوش ہو کر سو گیا۔ لاچی خیمے کے اندر پہنچی۔ ادھر اُدھر غور سے دیکھ کر اس نے مٹی کے کوزے میں سارے سکّے۔ نقدی اور نوٹ ڈال دیئے اور خیمے کے اندر زمین کھود کر اس نے مٹی برابر کر دی۔ اور پھر اس کے اوپر اپنی چٹائی بچھا کر اطمینان سے سو گئی۔ بہت عرصہ بعد

اسے بچوں ایسی گہری نیند آئی۔

صبح اس کی ماں نے گہری نیند سے جگا دیا۔ ورنہ وہ جانے کب تک سوتی رہتی۔ اُٹھ کمبخت لکڑیاں چُن کے لا۔ آج کھانا نہیں پکائے گی کیا۔ سورج سر پہ آگیا۔ لاچی ہڑبڑا کے اُٹھی۔ اور رفع حاجت کے لیے باہر چلی گئی۔ پھر اس نے جلدی جلدی ریلوے کے یارڈ میں پڑے ہوئے گھاس کے گٹھوں سے اِدھر اُدھر سے کچھ لکڑیاں۔ کچھ گرے ہوئے اُپلوں کے ٹکڑے جمع کیے اور واپس آکر اپنی ماں اور ماموں کے لیے چائے تیار کی۔ اتنے میں خیموں کے مرکز کی کھلی جگہ میں خانہ بدوش اکٹھے ہونے اور ڈھول بجانے لگے اور خوشی سے سب گیت گانے لگے۔

لاچی اپنا کوزہ چھوڑ کر بھاگی۔

آسمان صاف تھا۔ درختوں کی شاخوں پر لال لال شگوفے کھلے تھے۔ جیسے سینکڑوں آفتاب ٹہنیوں پر اُتر آئے ہوں۔ بہار کا یہ کیسا سرمدی اعجاز ہے! لاچی خوشی اور مسرت سے ان شگوفوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کا بیاہ ہوگا۔ آج وہ گل کے گھر جانے کی خوشی سے وہ ناچنے لگی۔ اور خانہ بدوشوں کے بیچ میں جا کھڑی ہوئی۔

یکایک دمارو کا سیاہ اور کھردرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پڑا اور وہ ناچتے ناچتے رُک گئی۔

آج جشن بہاراں ہے۔ دمارو خوشی سے بولا۔

ہاں آج جشن بہاراں ہے۔ لاچی بہت مسرت سے بولی۔

آج تمہارا بیاہ ہوگا۔ دمارو پھر خوشی سے چیخ کر بولا۔

ہاں آج میرا بیاہ ہوگا۔

لاچی بہت اطمینان سے بولی۔

مجھ سے۔ دمارو نے کہا۔ مجھ سے نہیں اپنے گل سے!

دمارو چیخ کر بولا۔ اپنے وعدے سے مکرتی ہے مادرزادی خانہ بدوش لڑکی کبھی اپنے وعدے سے نہیں مکرتی۔

تو نکال میرا روپیہ - لوگو پنچایت کرو - پنچایت بیٹھے! ابھی پنچایت بیٹھنے میں اپنا جھگڑا پیش کرتا ہوں۔

سب لوگ زمین پر بیٹھ گئے۔

سردار دمار دے نے کہا۔

اس لڑکی کو اس کے باپ نے ساڑھے تین سو روپے میں میرے ہاتھ ہار گیا۔ میں نے اسے اپنے خیمے میں لانا چاہا۔ کوئی بے انصافی کی؟

نہیں - سب لوگ سر ہلا کے بولے۔

یہ نہیں آئی - بولی میں تیرے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں نے اپنا روپیہ اس کے باپ سے مانگا۔ اس نے نہیں دیا۔ اس کی ماں سے مانگا اس نے نہیں دیا۔ بولو کوئی بے انصافی کی؟

نہیں - خانہ بدوش زور سے چیخے۔

تب اس لڑکی نے مجھ سے کہا۔ میں بہار کے دن تک تیرا روپیہ لوٹا دوں گی۔ آج بہار کا دن ہے اس نے آج تک صرف اسی روپے لوٹائے ہیں۔ ساڑھے تین سو میں سے صرف اسی آج میں اس سے کہتا ہوں تو میری ہو جا۔ بولو۔ کوئی بے انصافی کی ہرگز نہیں۔

پھر سب خانہ بدوش ایک آواز میں زور سے بول اٹھے دمار دے چپ ہو گیا۔ اور فخر مند نگاہوں سے لاچی کی طرف دیکھنے لگا۔

لاچی نے مضبوط آواز میں کہا۔ میں اس کا روپیہ لے آئی ہوں۔ رات کو یہ اپنے خیمے میں نہیں تھا۔ اپنی ہونے والی بیوی کا پلاسٹک کے مل کے مالک سے سودا کرنے گیا تھا۔

یہ جھوٹ ہے - یہ جھوٹ ہے - دمار دے زور سے چیخا۔ لاچی زور سے بولی - چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی سب پنچوں کے سامنے تیرا روپیہ لوٹائے دیتی ہوں۔

اتنا کہہ کر لاچی تیزی سے مڑی۔ اور اپنے خیمے کے اندر چلی گئی - اندر جس چٹائی پر وہ سوئی تھی وہ اسی طرح بچھی تھی - لاچی نے جلدی سے چٹائی کو وہاں سے ہٹا کر پھینک دیا - اور پھر زمین

کھودنے لگی۔ بھربھری مٹی اُدھڑتی گئی۔

تھوڑی دیر میں گڑھا نمودار ہو گیا۔ لیکن اس گڑھے میں کچھ نہ تھا۔ جہاں اس نے مٹی کا کوزہ رکھا تھا۔ وہاں اب کچھ نہ تھا۔ نہ کوزہ۔ نہ نوٹ۔ وہاں کچھ نہ تھا۔

لاچی لپک کر باہر آئی۔

باہر آتے ہی اس نے چیخ کر کہا۔ کس نے میرا روپیہ لیا ہے۔

سب لوگ چپ تھے۔

خانہ بدوشوں کا گروہ حیرت سے لاچی کو دیکھ رہا تھا۔

لاچی نے پلٹ کر اپنی ماں کا گریبان پکڑا۔

بول ماں میرا روپیہ کہاں ہے۔ ماں نے بڑی مضبوطی سے جواب دیا۔ میں نے نہیں لیا۔

ماں کی نگاہوں میں سچ تھا۔ لاچی وہاں سے پلٹ گئی۔ اس نے اپنے چچا مامن کو پکڑا چیخ کر بولی۔ میرا روپیہ واپس دے دے بدمعاش۔

مامن زور سے ہنسنے لگا بولا۔

یہ جھوٹی ہے۔ اب بہانے کرتی ہے۔

جھوٹی۔ مکار۔ فریبی۔ سارے خانہ بدوش چیخ پڑے آج اسے دمار کی دلہن بننا پڑے گا۔

آؤ آؤ۔ جاماں۔ روشنی منیاں آؤ۔ اسے دلہن بناؤ۔

گل پرانے پل پر کھڑا تھا۔ اور حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ خانہ بدوش اپنے خیموں کے باہر ناچ رہے ہیں۔ گا رہے ہیں اور زور زور سے دف بجا رہے ہیں۔ اور لاچی ان کے بیچ میں دلہن بنی کھڑی ہے۔ اور عورتیں بار بار اسے کچھ کہہ رہی ہیں۔

گل تیزی سے پل سے اتر کر خیموں میں چلا گیا۔

اس وقت لاچی کی ماں چاندی کی ہتھی والا خنجر خیمے سے نکال لائی تھی۔ اور لاچی کی طرف بڑھا

سے کہہ رہی تھی۔

اب تو ختم ہوگیا۔ سب جھگڑا ختم ہوگیا۔ تو ہار گئی ہے اب تجھے دُلہن کا ناچ ناچنا پڑے گا۔

یکایک گُل لاچی کے سامنے چلا گیا۔

اسے دیکھ کر سارے خانہ بدوش ذرا ذرا سا پیچھے ہٹ گئے۔ اور ٹیڑھی نظروں سے اُسے دیکھنے لگے۔ مگر سب خاموش تھے۔ نہ دف بجتی تھی نہ کوئی راگ سنائی دیتا تھا۔ جیسے زمین نے سانس روک لی ہو۔

لاچی:

لاچی نے گُل کو ایک نظر سے دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔

لاچی چل میرے ساتھ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ گُل نے بڑی بے خوف آواز میں کہا۔ لاچی وہیں کھڑی رہی۔

گُل نے حیرت سے پوچھا۔

لاچی تو نے دُلہن کا لباس پہنا ہے۔

ہاں:

تجھے کل کا وعدہ یاد نہیں ہے۔

یاد ہے میں نے کہا تھا کل میں دُلہن بنوں گی۔

مگر تُو تو میرے ساتھ چل کے دُلہن بننے والی تھی۔

لاچی جھک سی گئی۔ جیسے اس پر منوں بوجھ لاد دیا گیا ہو۔

وہ آہستہ سے بولی۔

کل وہ روپے چوری ہوگئے۔ میں اپنا قرضہ نہیں چکا سکی۔ چوری ہوگئے؟ گُل نے بے اختیار چیخ کر پوچھا۔ چوری ہوگئے۔

نہیں نہیں تو جھوٹی ہے۔ تو مجھ سے مذاق کرتی ہے۔

لاچی سر جھکائے گل کے سامنے کھڑی رہی۔

گل کو بے حد غصہ آیا اس کا سارا جسم سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

میں جانتا ہوں تو جھوٹ بولتی ہے۔ تو نے دو روپے دمارد کو دے دیئے ہیں۔ اور اب تو اس سے شادی کرنے کو تیار بیٹھی ہے۔ میرا باپ سچ کہتا تھا۔ یہ آوارہ اور مکار ہوتی ہیں۔ یہ شریف آدمیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر انہیں تباہ کر ڈالتی ہیں۔

لاچی نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں سے صرف ایک بار گل کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے سر جھکا لیا۔ گل اس کے زور سے تھپڑ مارنے کو تھا۔ پھر اس نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو روک لیا۔ دیر تک وہ لاچی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آہستہ سے گھوما۔ آہستہ سے پلٹا۔ آہستہ سے چلتا گیا۔ اب وہ آہستہ آہستہ سر جھکائے ٹیلے کی اوٹ میں جا رہا تھا۔

لاچی نے آہستہ سے کہا۔

وہ خنجر مجھے دے دو ماں۔ میں اب دلہن کا ناچ ناچوں گی۔ دف بجنے لگے۔ گھنگھرو کھنکنے لگے۔ جسم پگھلنے لگے۔ اور چہرے چمکنے لگے۔

گیتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ پاؤں تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ ہاتھ ناگوں کی طرح جنبش میں آتے گئے۔ لے تیز ہوتی گئی۔ ناچ کی دھمک ہر لحظہ بڑھتی گئی۔ خانہ بدوش ناچتے ناچتے خوشی سے وحشیانہ طور پر چیخنے لگے۔ رقص کے ہر موڑ پہ لاچی دمارد کے قریب آتی۔ اور رسم کے مطابق اپنے خنجر کو جھکا کر دمارد کے پاؤں سے چھو کر واپس چلی جاتی۔ ایسی پھرتی سے۔ اس تیزی سے۔ اس انہماک سے اس فنکاری سے وہ آج تک کبھی نہ ناچی تھی۔ ناچتے ناچتے وہ جیسے اپنے وطن کو۔ اپنے قبیلے کو۔ اپنی روایت کو لوٹ آئی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس نے کبھی کچھ اور بھی سوچا تھا۔ وہ بھول گئی اس نے کوئی اور سپنا بھی دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ سرکش نگاہ تھی جو ہر خانہ بدوش لڑکی کی آنکھوں میں ہوتی ہے اس کو نچلی اسی طرح طوفانی اور وحشی تھا۔ سمندر کی لہروں کی طرح تھپیڑے مارتا ہوا کسی زہریلی ناگن کی طرح پیچ و تاب کھاتا ہوا۔ ہر تہذیب سے بغاوت کرتا ہوا۔ ہر شہر آرو سے ٹکراتا ہوا اپنے

رقص میں خوش اپنے آپ میں غلطاں ناچ رہی تھی۔ اور خانہ بدوش زمین کی سنہری گرد اڑاتے ہوئے اپنے قبیلے کی مٹی کے گرد رقصاں تھے۔ اور دور اوپر درختوں کے سبز پتوں کے جھومر میں سُرخ شگوفے ہنس رہے تھے۔

یکایک ناچ کا آخری چکر لیتے ہوئے لاچی دمارد کے سامنے آئی۔ اور رسم کے مطابق اس نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کئے۔ تاکہ دمارد اسے اپنی آغوش میں لے لے۔ دمارد نے آگے بڑھ کے ناچتی ہوئی۔ لچکتی ہوئی لاچی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اسی لمحے لاچی نے اپنا خنجر اس کے سینے میں اُتار دیا۔

گل گلی میں کھڑا تھا۔

سامنے دروازے پر داؤد کی بیوی کھڑی تھی۔

گل چقماق کی چرخی پر ایک چھری تیز کر رہا تھا۔ اور بار بار گھومتی ہوئی چرخی کو اپنے پاؤں کی ضرب سے تیز کرتا جا رہا تھا۔ چھری کی دھار چقماق سے ٹکراتے ہوئے ایک تیز خراش دار آواز پیدا کر رہی تھی۔ کبھی کبھی چقماق اور لوہے کی ٹکر سے ایک شعلہ سا بلند ہوتا اور پھر بجھ جاتا۔

چرخی پھر چلنے لگی۔

داؤد کی بیوی نے گل سے پُوچھا۔

لاچی کو سزا ہو گئی۔

گل چرخی پر جھک گیا۔ جیسے غور سے وہ چرخی میں کسی خامی کو دیکھ رہا ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

ہاں اسے عدالت نے تین سال کی سزا دی ہے۔

داؤد کی بیوی نے اسے ہمدردی کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اب تم کیا کرو گے۔

گل نے اسی طرح چرخی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اس کا انتظار کروں گا۔

یہ کہہ کر وہ پھر چرخی چلانے میں اور چھری تیز کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک اس نے چھری کی دھار پلٹی اور دوسری طرف تیز کرنے لگا۔

ارے ارے یہ کیا کرتے ہو۔ داؤد کی بیوی حیرت سے بولی۔ پہلے تم چھری کو صرف ایک طرف سے تیز کیا کرتے تھے۔

گل نے آہستہ سے کہا۔

اماں۔ یہ دُنیا بڑی ظالم ہے۔ یہاں چھری کی دھار کو اب دونوں طرف سے تیز کرنا پڑیگا۔

دسواں باب

حاجی عبدالسلام اور میر چندانی دونوں دوست تھے۔ دونوں نے مل کر شہر میں ایک بنک کھولا تھا۔ دونوں نے مل کر اس بنک کے ذریعے لوگوں کو خوب لوٹا تھا۔ دونوں پکڑے گئے اور اب جیل میں سزا بھگت رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اس ہوشیاری سے کام لیا تھا کہ روپیہ پولیس ان سے نہ اگلوا سکی تھی۔ بہتر لاکھ کا غبن تھا۔ اتنا روپیہ کوئی آسانی سے کیسے دے سکتا ہے۔ چاہے برسوں کی جیل کیوں نہ ہو جائے۔ اس لئے دونوں بڑے مزے سے جیل میں رہتے تھے اور روپے کے زور سے جو چاہتے کرتے۔ اسسٹنٹ جیلر ان کا دوست بن گیا تھا۔ وارڈرز ان کی مٹھی میں تھے اس لئے دونوں دوست جیل میں بھی اسی شان سے رہتے تھے۔ جیسے وہ جیل میں نہ ہوں۔ مائیکل روڈ کے کسی اچھے فلیٹ میں رہتے ہوں۔ ان کا کھانا اچھے ہوٹلوں سے آتا تھا۔ اسٹیٹ ایکسپریس سے کم کا سگریٹ وہ نہ پیتے تھے۔ ریس جانے کو جی چاہتا تو سپرنٹنڈنٹ جیل کی نظر بچا کر ریس بھی چلے جاتے تھے کئی بار وہ ولنگڈن روڈ پر جا کر فلائنگ ہارس بھی سن آئے تھے۔ ان موقعوں پر احتیاطاً دو بندے کے دو وارڈرز بھی ان کے ساتھ رہتے ان کا روپیہ اب محفوظ جگہ پر تھا۔ اس لئے جیل سے نکل بھاگنے کا خیال بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہی سوچ کر اسسٹنٹ جیلر بھی انہیں ڈھیل دیتا ہو۔ اسسٹنٹ جیلر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اپنے زمانے میں ایک کالج میں معاشیات کا لیکچرار تھا۔ تنخواہ ساڑھے تین سو روپے تھی۔ کنبہ بڑا تھا۔ اس لئے ہمیشہ تنگدست اور چڑچڑا رہتا تھا

کلاس میں لڑکوں سے ایسا سلوک کرتا جیسے وہ تھانیدار ہو۔ پروفیسر نہ ہو۔ لڑکے اس سے ہمیشہ نالاں رہتے۔ دو تین بار کالج میں اس کے خلاف اسٹرائک بھی ہوئی۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کالج کا وہ لیکچرار تھا۔ انگریز پرنسپل تھا۔ انگریزوں کو اس زمانے میں اسٹرائک کے پیچھے انقلابیوں کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ اس کا فائدہ اٹھا کر اسسٹنٹ جیلر کالی چرن نے اپنے پرنسپل کی سفارش سے اپنا تبادلہ کرالیا۔ اور کالج کی لیکچرارشپ کو خیرباد کر کے جیل کے محکمے میں آ گیا۔ کیوں کہ صوبے کی جیلوں کا انچارج انگریز اس کے پرنسپل کا دوست تھا۔ یہ محکمہ کالی چرن کو بہت پسند آیا۔ بالکل اس کی طبیعت اور مزاج کے مطابق تھا۔ پھر یہاں اناج۔ گوشت۔ سبزی۔ دودھ۔ ملازم سب مفت ملتے تھے۔ امیر قیدیوں کو مراعات دے کر وہ ان سے ہر ماہ خاصی رقم اینٹھ لیتا تھا۔ کالج کے لڑکوں سے چند ذلیل قسم کے ٹیوشنوں کے سوا اسے کیا حاصل ہو سکتا تھا۔

یہاں وہ بے حد خوش تھا۔ جیسے اپنوں میں آ گیا ہو۔

یہ درست ہے کئی بار وہ معطل ہوا۔ کبھی اس کی ترقی ہوئی کبھی تنزل کیا گیا۔ مگر یہ تو زمانے کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ اونچی لہروں پر سوار ہو کر آدمی کبھی آگے نکل جاتا ہے۔ کبھی وہی لہریں اسے دھکیل کر پیچھے پھینک دیتی ہیں۔ زمانہ ایک سمندر ہے۔ اس میں ہمیں رہنا ہے۔ اس میں ڈوبنا ہے۔ اس کا غم کیا؟ کالی چرن صرف اتنی احتیاط ضرور کرتا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے سامنے اپنے آپ کو بیحد مستعد اور دیانتدار ثابت کرتا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل بھی ایک پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اگر وہ جیلر نہ ہوتا تو ادیب ہوتا۔ شاعر ہوتا۔ موسیقار ہوتا۔ لیڈر ہوتا۔ یعنی وہ ایسا کچھ ضرور ہوتا جہاں اسے اچھی بات کہنے اور سننے اور منوانے کے ذرائع میسر آتے۔ اس کا دل ایک عجیب و غریب نرمی اور مہربانی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ انسان کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا اس کے ذہن میں ایک عجیب و غریب تصورات کے ہیولے تھے۔ وہ خدمت کرنا چاہتا تھا اور نیک بننا چاہتا تھا۔ بچپن ہی سے اسے مصوری کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس کے والد رائے بہادر شری گنگا سہائے ڈپٹی انسپکٹر جیل خانہ جات تھے۔

اور یہ محکمہ ایک طرح سے ان کا اپنا ہی تھا۔ اور زمانہ انگریزوں کا تھا۔ اور رائے بہادر کا شمار

سرکار انگلیشیہ کے فرزندان خاص میں ہوتا تھا۔ اس لئے انھوں نے بھی مناسب سمجھا کر اپنے بیٹے خوب چند کو جیل میں بھرتی کر لیا جائے۔ گو خوب چند کا ارادہ پیرس میں مصوری سیکھنے کا تھا۔ لیکن رائے بہادر کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور وہ جیل کے محکمے میں بھرتی ہو گیا۔ اگر وہ ضدی اور خود سر ہوتا تو بھی کارہ کر مصوری کو جاری رکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ بے حد شریف آدمی تھا۔ اس لئے وان گوگ تو نہ بن سکا۔ جیلر بن گیا۔ لیکن اس کی طبیعت کی نیکی اور دل کی شاعری اور تصورات کی مصوری یہاں بھی اثر دکھائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ قیدیوں سے بہت نرمی اور ملائمت سے پیش آتا تھا۔ اپنے عملے کو اس نے بہت ڈھیل دے رکھی تھی۔ افسانوں پہ بھروسہ کرنا اس کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ مصوری کا شغل اب بھی جاری تھا لیکن وہ جدید مصوری سے بہت بیزار تھا جس میں عورتیں سر کنڈوں کی طرح بدصورت اور ذہن پتلی ہوتی جاتی ہیں۔ اور مرد جنس کی طرح موٹے۔ اسے اوک مصوری بھی پسند نہ تھی جس میں دیہاتیوں کا سا بچکانہ پن پایا جاتا تھا۔ اسے پرانے بنگال اسکول کی مصوری بہت پسند تھی۔

دھیمی دھیمی سست اور سوئی ہوئی مصوری۔ اونگھتا ہوا سا ماحول۔ فطرت غنودگی کے نشے میں سرشار۔ بانس کے جھنڈوں میں نیم مستور گاؤں اور ندی کے کنارے خیالات میں کھوئی حسینہ۔ ایسی پیاری۔ ایسی نازک ایسی کیسی آنکھوں والی کہ اگر پلٹ کر کہیں ایک نگاہ بھی ڈال دے تو آدمی وہیں خاک ہو جائے جانے کس دیس میں یہ عورتیں رہتی ہیں؟ کیا کھاتی ہیں؟ کھاتی بھی ہیں کہ صرف اپنے حسن کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں۔ اور واقعی ایسی مکمل عورت کو کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔؟ ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو ایک تصویر ہے جسے آدمی سونے کے فریم میں جڑوا کر دیکھا کرے۔ اور بہت سے آدمی ایسا سوچتے ہیں۔ اس لئے بہت سی عورتیں ایسے ہی سونے ایک فریم کی خواہش کیا کرتی ہیں۔ خوب چند کے پاس سونے کا فریم تو تھا۔ لیکن وہ مکمل عورت اسے آج تک نہ مل سکی تھی۔ اس لئے عمر کے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی وہ کنوارا تھا۔ اس لئے اس کے دل میں امید کی وہ لو بھی کم ہو گئی تھی شاید اسے وہ مکمل عورت کبھی نہ مل سکے گی

اور جوں جوں اس کے دل میں یہ نااُمیدی گھر کرتی وہ اپنی تصویروں کی عورت کے نقوش نازک سے نازک تر سانچوں میں ڈھالتا جاتا۔ کبھی کبھی ان تصویروں کو دیکھ کر رو دیتا۔ کیا ان میں کوئی تصویر زندہ نہیں ہوسکتی۔ کیا یہ ہونٹ بول نہیں سکتے۔ کیا ان بانہوں کا مرمریں بانہوں میں نہیں آسکتا۔ یہ سحر آرا پلکیں اگر رُخساروں پر گر جائیں تو کیا ہو۔ تو کیا ہو۔ کوئی بھلا اسے یہ بتانے کو تیار نہ تھا کہ اس معجزے کے بعد محبت ہوگی۔ محبت کے بعد ممکن ہے شادی ہو۔ شادی کے بعد ممکن ہے بچے ہوں۔ بچوں کے بعد ممکن ہے جھگڑے ہوں۔ بچوں اور جھگڑوں کے بعد طویل سالہا سال ساتھ رہنے کے بعد وہ عورت سرکنڈے کی طرح دُبلی پتلی نخس کی طرح موٹی ہوجائے۔ اور اس کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہوجائے۔ شاید اسی لئے اس نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ وہ صرف پانی پر تیرتے ہوئے کنول دیکھنا چاہتا تھا۔ نہ اس کیچڑ کو جہاں کنول پیدا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس انجام کو جہاں پر کنول کی پتی پتی مُرجھا جاتی ہے خوب چند ایک خالص رومانیت پسند انسان تھے۔ اور اپنے تصورات کے جیل خانے میں بند رہتا تھا۔ اس کی طرح بہت سے انسان ہمیشہ کسی نہ کسی جیل خانہ میں بند رہتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے ہیں۔

جب لاچی پہلی بار سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں لائی گئی تو خوب چند اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یکایک اسے محسوس ہوا جیسے اب تک جو تصویر اس کے دل کے نہاں خانے میں چھپی ہوئی تھی آج زندہ ہوکر اس کے سامنے جلوہ گر ہے۔ وہی فسردہ۔ سوگوار سا حُسن۔ آنکھوں میں وہی نشیلا پن۔ چال کا وہی انداز۔ گردوپیش سے بے پروا۔ اور بے نیاز لاچی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ چند لمحوں تک وہ اسے مبہوت اور پریشان دیکھتا رہا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اُسے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کا اسٹینوگرافر تھا۔ دو اور کلرک تھے وارڈن تھے اچھا خاصا عملہ تھا خوب چند نے لاچی کے چہرے سے نظریں ہٹا کر لاچی کے کاغذات پر ڈالیں۔ یہاں پر اسے ایک اور دھچکا لگا۔

تم نے قتل کیا ہے۔ ! خوب چند نے بے اختیار ہوکر حیرت سے لاچی کی طرف

دیکھ کر کہا۔

وہ نہ یہاں کیوں آئی جی۔ لاچی نے پوچھا۔

سیدھے سیدھے بات کرو۔ ایک وارڈرن بولا۔ یہ سپرنٹنڈنٹ جیل ہیں۔

اچھا۔ لاچی نے ہاتھ کے اشارے سے انتہائی بے پروائی سے خوب چند کو سلام کیا۔ جیسے اپنے ماتھے سے کوئی مکھی ہٹا رہی ہو۔

نہیں نہیں بات کرنے دو۔ خوب چند نرمی سے بولا۔ اور کی نگاہیں کاغذات پر جھک گئیں۔ وہ دیر تک کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ چند لمحوں تک وہ لاچی کے چہرے کی طرف نہ دیکھ سکا۔ جس کے چہرے پر اب استہزا کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

یہ تصویر بولتی بھی ہے۔ خوب چند نے سوچا۔ متحرک بھی ہے لیکن سینما کی طرح نہیں زندگی کی طرح۔ پھر بھی اُسے شدید دھچکا لگا۔ کیوں لگا۔ کیا اس لئے جس طرح وہ تصویر کو بولتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح یہ تصویر نہیں بول رہی تھی۔ اس کی تصویر تو شاید اس سے ٹیگور کے نغموں میں خطاب کرتی۔ عمر خیام کی رباعیاں سناتی یا کیٹس کی بسیا کی طرح کسی انجانے جزیرے کو مدھم مدھم سروں کے میٹھے سنگیت سے لبریز کر دیتی۔ لیکن یہ کیسا کھردرا سپاٹ لہجہ تھا اس تصویر کا؟ خوب چند کو شدید ذہنی کوفت ہوئی۔ اس نے ذرا کڑے لہجے میں پوچھا۔

کوئی کام جانتی ہو۔ باسکٹ بن سکتی ہوں اور چٹائیاں اور ..... وہ رک گئی۔

اور ..... خوب چند نے پوچھا۔

اور نٹوں کے سب کرتب جانتی ہوں۔ ایک موٹے رسے پر چل سکتی ہوں۔ چلتے ہوئے گولے میں گزر سکتی ہوں۔ ایک سانس میں دس قلابازیاں لگا سکتی ہوں۔

کدھر گئی وہ تصویر وہ بانسوں کے سرسراتے ہوئے جھنڈ۔ ہوا رومان کی خوشبو سے مہکی ہوئی، اور ندی کے کنارے گردن جھکائے اداس محروں حسینہ۔ کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ ارے یہ بالکل تصویر ہے۔ لیکن کتنی مختلف۔ خوب چند اندر ہی اندر بلبلا اٹھا۔ پچاس برس

سے وہ جس تصویر کو دیکھتا آیا تھا آج وہ ایک لمحے میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے قدموں میں پڑی تھی۔

لاچی کی آواز آ رہی تھی۔ اور پنجہ بھی لڑا سکتی ہوں لاچی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔ لڑاؤ گے۔

کمرے میں جتنے لوگ تھے سب ہنس پڑے۔ مگر دلدار خاں پنجابی وارڈرن کو بے حد غصہ آیا۔ اور یونہی سپرنٹنڈنٹ جیل کی عزت رکھنے کے لیے یہ موقعہ اچھا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔

صاحب کی بات جانے دو پہلے ہم سے پنجہ لڑاؤ۔

دلدار خاں پنجابی نے اپنا موٹا کھردرا ہاتھ لاچی کی طرف بڑھایا لاچی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ بولی۔

تمہارا ہاتھ مجھ سے کھردرا معلوم ہوتا ہے۔

کمرے میں سب لوگ ہنسنے لگے۔

دلدار خاں نے جھک کر طنزاً کہا۔

بس ڈر گئیں۔

لاچی کا منہ لال ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دلدار خاں کی ہتھیلی پر جھپٹا مارا۔ اور اپنی انگلیاں اس کی انگلیوں میں پھنسا دیں۔ دلدار خاں نے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر زور لگایا۔ لاچی سر سے پاؤں تک لچک گئی۔ لیکن اس کا بازو خمیدہ نہ ہوا۔

حرامزادی! ضدی۔

دلدار خاں جھلا کر بولا۔ اور اس نے پھر پورا زور لگایا۔ حرامزادہ تو۔ تیرا باپ! پنجہ لڑا۔ باتیں نہ کر۔

لاچی غصے میں بولی۔

دلدار خاں کا پورا زور لاچی کے ہاتھ پر پڑ رہا تھا۔ لیکن لاچی نے ضدّی کے گر دنی نہیں

سیکھے تھے۔ اس نے اپنے بدن کو جھلا کر اس زور کو سارے بدن پر تقسیم کر لیا۔ مگر اس کی بانہہ اسی طرح دلدار خاں کی بانہہ سے خمیدہ ہو کر اُلجھی رہی۔

دلدار خاں کا چہرہ جو پہلے سانولے رنگ کا تھا۔ اب غصہ سے سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ یکایک لاچی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنسنے لگی۔ اور بولی۔ دیکھ اب میں اپنا پنجہ چھڑاتی ہوں۔ اس کے بعد وہ جانے کسی طرح لچکی اور ایک حرکت اس نے کی کہ ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے لاچی کا پنجہ دلدار کے شکنجے سے آزاد ہو گیا۔

کمرے میں سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

دلدار خاں کا ہاتھ لاچی کو مارنے کے لئے ادھر اٹھا۔ لیکن سپرنٹنڈنٹ جیل کے زرد۔ دوشت چہرے کو دیکھ کر وہیں رہ گیا۔

دلدار! یہ کیا حماقت ہے۔ خوب چند نے ذرا درشتی سے کہا۔

پھر عورتوں کی انچارج جینا بائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

جینا بائی اسے لے جاؤ اور چھ ماہ تک اسے دوسری عورتوں سے الگ رکھو۔ بہت خطرناک عورت معلوم ہوتی ہے۔ میں الگ نہیں رہوں گی۔ میں الگ نہیں رہوں گی۔ یکایک لاچی زور سے چیخی۔ جینا بائی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

خوب چند کے حکم سے دو تین وارڈروں نے مل کر لاچی کو گھیرا اور اسے عورتوں کے سرکل جیل میں پہنچا آئے جو بڑی جیل کے جنوبی کونے میں تھی۔

رات بھر خوب چند کو نیند نہیں آئی۔

وہ بہت دیر تک اپنے خوبصورت فلیٹ کی مدھم مدھم روشنیوں میں دیواروں پر آویزاں تصویروں کو دیکھتا رہا۔ اسے اپنی ان تصویروں سے کیسی محبت تھی جیل کی سخت گیر، بورئیت اور ظلم و ستم سے بھری ہوئی دُنیا کے بعد یہ تصویریں ہی اس کا سہارا تھیں۔ یہی تصویریں اس کی بیوی۔ اس کے بچے اس کے دوست۔ برسوں کی بیتی ہوئی ریاضت اور اُلفت اس نے ان تصویروں کی ایک

ایک لکیر میں کھلا دی تھی۔ لیکن یہ برسوں کی جانی پہچانی تصویریں آج اسے کتنی انجان اور بے کار نظر آ رہی تھیں۔ جیسے سب کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ سب کچھ گر گیا تھا اور سب کچھ کرنے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

وہ تو ان تصویروں کو جانتا بھی نہ تھا۔ یہ تصویریں وہ کیسے بنا سکتا تھا۔ یہ تصویریں بالکل مصنوعی تھیں۔ یہ تصویریں اس کی نہ تھیں۔ یہ کسی احمق نومشق کے بے معنی پیچ و خم تھے۔ ان میں کیا دکھا ہے۔ برسوں سے وہ ان تصویروں کو بلانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن یہ تصویریں کیسے بولتیں۔ مُردہ تصور کی مُردہ لاشیں ان میں روح نہ تھی۔ پھر یہ تصویریں کیسے بولتیں۔ اُسے لاچی پر بہت غصہ آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بیکار کاموں میں اُلجھ کر بوڑھا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی غلط راستے پر چلتے چلتے ایک اندھے کنوئیں پر جا پہنچا ہے۔ اس نے ایک ایک کرکے دیواروں سے سب تصویریں اُتاریں۔ اُنھیں فریم سے الگ کیا۔ اور آہستہ آہستہ اُنھیں اس طرح پھاڑنے لگا جیسے وہ اپنی زندگی کے پرانے ورق چاک کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کیونکہ زندگی کے ورق کاغذ کے ورق تو ہوتے نہیں۔ وہ پھر نہیں لکھے جا سکتے۔

ٹھیک ہے اب وہ صرف جیلر بنے گا۔

اس نے دل میں کہا۔

جیناں بائی جب جوان تھی تو اپنے جسم کا دھندا کرتی تھی۔ اور جب شباب ڈھلنے لگا تو اس نے جیب کاٹنے کی سائڈ لائن بھی اختیار کر لی۔ ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مشہور کٹنی بن چکی تھی۔ اور اس کا کام خوب صورت عورتوں اور لڑکیوں کو پھانسنا اور اُنھیں مشہور دلالوں کے ہاتھ فروخت کر دینا تھا۔ اس لئے اسے خاصے پیسے مل جاتے تھے۔ خطرہ بھی کافی تھا۔ چار چھ بار اسے جیل بھی ہوئی تھی۔ آخری بار جب اس نے ایک حاملہ لڑکی کو پھانسا تو اس کے بچے کا گلا گھونٹ دینے کے جرم میں جیناں بائی کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ وہ بڑی رحم دل آنکھوں والی۔ پوپلے مُنہ والی۔ میٹھے بول والی بوڑھی عورت تھی۔ اس کی چال ڈھال سے ہر وقت ایک عجیب سی ماتا برستی رہتی تھی۔ جس سے وہ عورتوں کی جیل میں بہت پاپولر ہو گئی تھی۔ چار چھ بار جیل کاٹ کے اب وہ اس ماحول

سے مانوس ہوگئی تھی۔ اب تو یہی جیل اس کا گھر تھی وہی اس کا دیس تھی وہی اس کی سیاست۔ وہ جیل کی عورتوں میں ممتاز تھی تو جیل کے حکام بھی اسے پسند کرتے تھے مردوں کی جیل کے مشہور غنڈے بھی اس کی عزت کرتے تھے۔

اس لئے کہ وہ سب کام جانتی تھی۔ اور انتہائی رازداری اور دیانت داری اور پوری پوری سچائی سے بے ایمانی کے سارے کام پورے کرتی تھی۔ جیسے ہر بزنس مین کو ہونا چاہیئے! افسوس حالات نے یاوری نہیں کی۔ اسے تعلیم نہیں ملی۔ اور وہ ایک غریب عورت تھی۔ ورنہ ایک کامیاب بزنس مین کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں۔ اگر اسے عمر قید نہ ہوتی تو شاید ایک دن وہ لکھ پتی ہو جاتی جیناں بائی باہر کی دنیا کے پیغام عورتوں کی جیل میں پہنچاتی تھی۔ مردوں کی جیل اور عورتوں کی جیل میں رابطہ بھی اسی کے ذریعے ہوتا تھا۔ چرس اور افیم کی درآمد بھی اسی کے ذریعے ہوتی تھی۔ جیل میں دو تین عورتیں ایسی تھیں کہ کسی طرح مارفیا کے انجکشن کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھیں۔ یہ کام بھی جیناں بائی کے سپرد تھا۔ اس کے علاوہ آہنی سلاخوں کے ادھر ادھر کیا عشق نہیں ہو سکتا؟ اس جیل کے لوگ کیا عورتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا وہ مرد نہیں ہوتے۔ کیا ان کے جذبات نہیں ہوتے۔ کیا وہ خشک ماچس کی طرح بھڑک نہیں سکتے۔ زندگی ایک غبارہ ہے جسے اگر ایک طرف دباؤ تو دوسری طرف سے اُبھر آتا ہے۔ بہت زیادہ دباؤ تو پھٹ جاتا ہے۔ اور یہ بھی ایک طرح سے بوجھ کے خلاف احتجاج ہی ہے۔ جسے سمجھنے کے لئے کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن جیناں کبھی قیدیوں پر غیر معمولی اور زیادہ دباؤ نہیں ڈالتی تھی۔ بس اتنا ہی جتنا وہ برداشت کرلیں۔ کیونکہ جو سمجھدار مجرم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پیشے میں شریف پیشہ انسانوں کی طرح دباؤ ڈالتے ہیں۔ بس اتنا بلیک میل کرو جتنا دوسرا برداشت کر سکے۔ بس اتنی رشوت لو جتنی دوسرا دے سکے۔ بس اتنی بے عزتی کرو جتنی دوسرا گوارا کر سکے۔ بس اتنی چوری کرو جس سے دوسرا زندہ رہ سکے۔ تاکہ اس کے گھر میں پھر چوری کی جا سکے۔ جرم اور سیاست میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔

پہلے چھ ماہ بہت آرام سے کٹے۔ گل بھی برابر ملنے آتا تھا۔ کیا بھیک مانگے بغیر

چوری کیے بغیر کسی سے بے عزت ہوئے بغیر ملتا تھا مشقت بھی معمولی تھی۔ دوسری عورتوں کے لئے تکلیف دہ ہوگی۔ لیکن لاچی کے لئے معمولی تھی۔ چھ ماہ کے بعد جو لاچی دوسرے قیدیوں سے الگ رہی تو اس کے دل میں ایک سکون۔ ایک طمانیت سی پیدا ہوگئی۔ باہر کی ہنگامہ پرور زندگی کے بعد جیل کی یہ زندگی لاچی کو بے حد پرسکون اور خوب صورت معلوم ہوئی۔

ایک روز جیناں بائی لاچی کے پاس گئی اور اس سے بولی۔

چل تجھے سپرنٹنڈنٹ جیل نے بلایا ہے۔

کیوں بلایا ہے۔

مجھے کیا معلوم۔ جیناں نے مسکرا کر کہا۔ تیرے فائدے کا کوئی کام ہوگا۔

چل ——

لاچی جیناں بائی کے ساتھ ہولی۔ خوب چند نے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس وقت سات بج چکے تھے۔ آفس کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ خوب چند نے آفس سے ملحق ایک کوٹھری خالی کروائی تھی۔ اور اسے اپنے لئے دن میں آرام کرنے اور کھانا کھانے کا کمرہ بنا لیا تھا۔

یہیں پر مصوری کا سامان بھی گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جب لاچی کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے لکڑی کے ایزل پر ایک کورے سفید کاغذ کو ٹنگے دیکھا تو حیرت سے بولی۔

یہ کیا ہے۔

تمھاری تصویر بناؤں گا۔

خوب چند نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

میری تصویر۔ لاچی حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات و تاثرات کا اظہار کرنے لگی۔

خوب چند نے سرہانے کے ایک کونے میں پڑی گٹھری کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

وہ تمھاری چنری۔ قمیص۔ واسکٹ اور گھاگرا پڑے ہیں۔ یہ جیل کے کپڑے اتار کے انھیں پہن لو۔ اور جب پہن لو تو مجھے آواز دے دینا۔ میں آفس میں بیٹھتا ہوں۔

بہت اچھا۔

لاچی لپک کر کٹھری کی طرف بڑھی۔

خوب چند اور جیناں باہر آ گئے۔

باہر آفس میں آ کے خوب چند نے جیناں سے کہا۔

اب تم جاؤ۔

جیناں نے ایک پُر فریب مسکراہٹ سے خوب چند کی طرف دیکھا۔ جھک کر سلام کیا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد لاچی کی آواز آئی۔

اندر آ جاؤ۔

خوب چند اندر گیا۔

لاچی لکڑی کے ایک چھوٹے سے اسٹول پر دن لئے ایک عجیب بانکی ادا سے کھڑی تھی۔ خوب چند کو دیکھتے ہوئے بولی۔

بس ایسی تصویر کھینچ دو۔

ایسی ہی کھینچوں گا۔

خوب چند نے قلم سنبھالا اور رنگوں کی آمیزش شروع کر دی۔

مگر کسی سے کہنا مت میں تمہاری تصویر بنا رہا ہوں۔

اچھا نہیں کہوں گی۔ مگر اس میں کیا بُری بات ہے۔ سبھی لوگ فوٹو لیتے ہیں۔ ایک بار ایک انگریز نے اسٹیشن پر میرا فوٹو لیا تھا۔ اور مجھے پانچ روپے بھی دیئے تھے۔ بہت لوگ میرا فوٹو لیتے ہیں۔

یہ فوٹو نہیں ہے۔

یہ تصویر ہے۔ اسے برش سے۔ اس رنگ سے اس کاغذ پر بناتے ہیں۔

اس میں کتنا ٹائم لگے گا۔

یہ تصویر دس دن میں بھی بن سکتی ہے۔ دس مہینوں میں بھی بن سکتی ہے۔ دس سال بھی لگ سکتے ہیں۔

تو میں کیا دس سال تک تمھاری جیل میں رہوں گی۔

نہیں جب میں تمھارے گھر آکر تمھاری تصویر بنایا کروں گا۔

میرا تو کوئی گھر نہیں ہے۔ لاچی اداس ہو گئی۔ ہوتا اگر گل سے میری شادی ہو جاتی۔

گل وہی پٹھان جو تم سے ملنے آتا ہے۔ خوب چند نے اس سے پوچھا۔

ہاں۔

تم اس سے پیار کرتی ہو۔

زندگی سے زیادہ چاہتی ہوں بابو۔ ایک بات مانو گے۔ لاچی نے یکا یک پُر امید ہو کے پوچھا۔

بتاؤ۔

گل کو بھی جیل میں رکھ دو۔ اسے یہیں کہیں ایک کوٹھری دے دو۔ تمھارے ادھر بہت جگہ ہے ہم دونوں کہیں رہ لیں گے۔ یہیں اپنا گھر بنا لیں گے۔

خوب چند خوب ہنسا۔

بولا۔

پگلی جیل میں مجرم آتے ہیں سزا کاٹنے کے لیے۔ کیا تمھیں باہر کی دنیا میں اور جیل کی دنیا میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

لاچی نے بہت سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

باہر کی دنیا بھی ایک جیل ہے بابو فرق اتنا ہے کہ اس میں لوہے کی سلاخیں نہیں ہوتیں لاچی خوب چند کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر خلا میں کہیں دیکھ رہی تھیں

خوب چند اس کے سوچ میں ڈوبے ہوئے حُسن سے مبہوت اسے دیکھتا رہا۔

یکایک لاچی مُڑی تو خوب چند بھی گھبرا کے ایزل کی طرف پلٹا۔ لاچی نے ہنس کے کہا۔

ارے بابو تم نے تو ابھی تک تصویر شروع بھی نہیں کی۔ یہ کاغذ تو کورا ہے۔

ابھی میں تمھیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مجھے سمجھنے کی کوشش۔ مجھ میں کیا ہے۔ میں تو بس لاچی ہوں۔

یہی تو مشکل ہے۔

کیا۔

کچھ نہیں۔ خوب چند ذرا تلخی سے بولا۔ تم اسٹول پر چپکی کھڑی رہو۔ اور اپنی جگہ سے ہلو نہیں۔ اور کوئی بات بھی مت کرو۔

یہ تو بہت مشکل ہے۔

مگر اس کے بغیر تصویر نہیں بن سکتی۔

بہت اچھا اب میں بالکل چپ رہوں گی۔

لاچی نے اپنے مُنھ پر انگلی رکھ دی۔

خوب چند نے پوز دیا۔

اور وہ اسی پوز میں چند منٹ ساکت کھڑی رہی۔

خوب چند ایزل پر تصویر بنانے لگا۔

چند منٹ کے بعد لاچی بولی۔

بابو مجھے پیاس لگی ہے۔

اب خوب چند اس کے لئے پانی لے کر آیا۔

پھر چند منٹ کے بعد لاچی بولی۔

بابو! اگر تم بھی کسی کو مار کے بھاگ آجاؤ تو تم اسے اپنی جیل میں جگہ دو گے۔

کسی کو مار کے آسئے گا۔

کسی کو بھی مار دے گا۔ اس دنیا میں بہت ظالم ہیں مارنا گناہ ہے جرم ہے اور فرض کرو گل کو ڈھائی سال کی سزا نہ ہوئی عمر قید ہو گئی۔

تو میں بھی زندگی بھر اس کے ساتھ جیل میں رہوں گی۔ فرض کرو اُسے پھانسی ہو گئی۔

باپ رے بابو یہ تو غلط بات ہو گئی۔ لاچی نے ایک دم کہا۔

پھر سوچ سوچ کر بولی۔

اچھا تم تصویر بناؤ۔ اب میں کچھ نہ کہوں گی۔

وہ پھر پونڑے کے کھڑی ہو گئی۔

خوب چند نے اسے تہدیدی انداز میں کہا۔ اب ہلنا مت اپنی جگہ سے۔

مشکل سے آدھ گھنٹہ گزرا ہو گا لاچی نے کہا۔

بابو تم جیل کے سب سے بڑے بابو ہو۔

ہاں میں سپرنٹنڈنٹ جیل ہوں۔

سپری ٹان۔

لاچی نے رکتے رکتے اس کا عہدہ یاد کرتے ہوئے کہا۔

ہاں سپری ٹان۔ خوب چند ہنسا۔

اور سپری ٹان سے بڑا جیل کا بابو اور کوئی نہیں ہوتا۔

لاچی نے پوچھا۔

ہوتا ہے ڈپٹی انسپکٹر جنرل۔

ڈپٹی جرنیل، اس سے بڑا بابو کون ہوتا ہے۔

اس سے بڑا جرنیل ہوتا ہے۔ خوب چند نے ہنس کر کہا۔

اور اس سے بڑا کون ہوتا ہے۔؟

اور اس سے بڑا خدا ہوتا ہے۔ خوب چند نے گویا معاملے کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

لاچی چُپ ہو گئی۔ دیر تک چپ رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ خدا بھی مرد ہے۔ اس سنسار میں جتنے بڑے بڑے بابو ہیں سبھی مرد ہیں۔ پھر مجھے انصاف کہاں سے ملے گا۔

خوب چند چونک گیا۔ وہ پلٹ کر لاچی کی طرف دیکھنے لگا۔ لاچی کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ اسے مطلق کوئی احساس نہ تھا کہ اس نے کیا بات کہہ دی۔ وہ پوز لیے۔ دم اونچا کئے چُپ چاپ کھڑی تھی۔ خوب چند دیر تک اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ پھر گھوم کر ایزل پر تصویر شروع کرنے لگا۔ لاچی یکایک اُچھل کر لکڑی کے اسٹول سے نیچے آ گئی۔

خوب چند نے گھبرا کے پُوچھا۔ کیا ہے۔

کچھ نہیں میرے ٹخنوں پر خارش ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر لاچی اپنے ناخنوں سے اپنے ٹخنے کھُجانے لگی۔ خوب چند اس کی بے تکلف معصومیت پر مُسکرا دیا۔

گیارہواں باب

لاچی کے مقدمے نے اسٹیشن یارڈ کے علاقے کے لوگوں کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ پولیس کی دوڑ دھوپ۔ اخباری رپورٹروں کے انٹرویو۔ خانہ بدوشوں کے قبیلے کی تعداد ویروں نے خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کچھ لوگ لاچی کی بہادری کی تعریف کرتے تھے۔ اور اکثر اس کے خلاف تھے۔ لاچی نے سماج اور قبیلے کے قوانین کو توڑا تھا۔ اور یہ دونوں ادارے اتنی آسانی سے اُسے معاف کر دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ پلاسٹک مل کے مالک کا نام بھی اس مقدمے کے دوران میں لیا گیا تھا۔ اور اس کی گواہی بھی ہوئی تھی۔ پلاسٹک مل کا مالک اس علاقہ کا سربرآوردہ آدمی تھا۔ اس نے اس مقدمہ سے نکلنے کے لئے اپنا پورا رسوخ استعمال کیا تھا۔ صرف یہی نہیں۔ اس نے اس بات کی بھی پوری کوشش کی تھی کہ لاچی کسی طرح اس مقدمے کے چنگل سے نہ بچ نکلے۔ مالاں کہ لاچی کے دیرینہ بیان اور اقبال جرم کے بعد اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ پھر پلاسٹک مل کے مالک کی کوشش یہی رہی کہ لاچی کو اس مقدمے میں زیادہ سے زیادہ سزا ہو۔ مردوں کا سماج ہو یا مردوں کا قبیلہ ہو وہ عورت کے بہت سے گناہوں کی پردہ پوشی کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ ہرگز ہرگز یہ گوارہ نہیں کرتے کہ کوئی عورت ان سے باغی ہو کر اپنی حرمت کی حفاظت کے لئے لاچی کی طرح زندگی کی بازی لگا دے۔ کیوں کہ اس کا اثر دوسری عورتوں پر پڑتا تھا۔ نوجوان عورتوں نے ایک ایک کر کے بُرے دھندے سے انکار کر دیا۔ ان کے شوہر خفا

تھے قبیلے کا سردار خفا تھا ۔ قبیلے کی بوڑھی عورتیں خفا تھیں لیکن لاچی کی دیرینہ مدافعت نے صدیوں کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اور وہ طوفان جو ہر عورت کے سینے میں لہریں لیتا تھا سینہ توڑ کر باہر آگیا تھا۔ اور غم وغصہ سے بپھری ہوئی نوجوان خانہ بدوش عورتوں کے چہروں پر کھیل رہا تھا ۔ اب وہ مرغی چرانیں یا کوئلہ چرائیں، نوکریاں بنیں یا چاندی کے چھلے بیچیں ۔ یا محنت مزدوری کا کوئی اور کام کریں لیکن وہ اپنی عزت بیچنے پر تیار نہ تھیں ۔ اور اب وہ طعنے دے دے کر اپنے خاوندوں کو شرم دلانے لگیں کہ محنت کرنا سیکھیں تین لڑکیاں تو قبیلے سے بھاگ گئی تھیں ۔ اور انھوں نے شہر کے غریب لیکن محنتی نوجوانوں سے شادیاں کرلی تھیں ۔ قبیلے میں پھوٹ پڑگئی تھی اور طوفان کے پہلے ہی ریلے میں پرانے رسم ورواج خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے تھے اور اٹھتی ہوئی بغاوت کی موجوں کے زور نے اس قبیلے کو اس کی مرضی کے خلاف بیسویں صدی کی طرف دھکیل دیا تھا ۔ یونہی ہوتا ہے ۔ اور بہت سے لوگوں کی زندگی میں ہر دور میں اور ہر سماج میں یونہی ہوتا ہے ۔ یہی وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتے ۔

اپنی زنجیروں سے ۔ اپنی عادات سے ۔ رسم ورواج سے ۔ اندھے مذہبی سماجی عقائد سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں ۔ لیکن بغاوت کی قوتیں انھیں اپنے طوفان کے ریلے میں بہاکر آگے منزل کی طرف دھکیل کر روانہ کر دیتی ہیں ۔ اور ان میں اتنی شدت اور قوت ہوتی ہے کہ ہر قدم پر پرانے توہمات کا سہارا لینے والا انسان اپنی مدافعت نہیں کرسکتا اور آگے بڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

قبیلے پر جو ردعمل ہوا تھا اس نے اسٹیشن یارڈ کے سارے علاقے کے سماج میں ایک کھلبلی سی پیدا کر دی تھی ۔ مختلف قوتیں جمع ہوکر قبیلے کے خلاف حرکت کر رہی تھیں ۔ اور یہ بہت ہی آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر ہوا ۔ قبیلے کی عورتیں علاقے کے اوباش لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھیں ۔ اور بڑا سستا سہارا تھیں ۔ قبیلے کی نوجوان لڑکیوں کی بغاوت سے دلالوں کے پیشے پر کاری ضرب پڑی تھی ۔ پھول والوں کی دکانوں کی بکری کم ہوگئی ۔ رات پالی کرنے والی ٹیکسیوں کا دھندا کم ہوگیا ۔ اور ناجائز شراب بیچنے والوں کے کاروبار پر اثر پڑا ۔ اس کے ساتھ پلاسٹک مل مالک کی دشمنی ملا لیجئے ۔ جن کا علاقے کے ہر کوسنے میں اثر ورسوخ تھا ۔ تو قبیلے کے خلاف لوگوں کے دلوں

میں نفرت کا جذبہ بڑھ رہا تھا اس کی ایک ہلکی سی تصویر ذہن میں آجائے گی۔

دھیرے دھیرے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا اس قبیلے کا فائدہ کیا ہے۔ یہ قبیلہ ہمارے علاقے میں اتنے عرصے سے بے اطمینانی پھیلا رہا ہے۔ اس طرح سوچنے والے بہت سے لوگ تھے۔ اور طرح طرح کے لوگ تھے۔ اور صرف بڑے ہی لوگ نہ تھے جنھیں قبیلے کی عورتوں کے رویے نے تکلیف پہنچائی تھی۔ لاچی کے مقدمے سے شہ پاکر شریف لوگ بھی میدان میں آگئے تھے۔ شریف گھرانوں کی عورتوں اور بیویوں نے بھی اپنے خاوندوں کو محض اپنے تحفظ کی خاطر اس قبیلے کے خلاف اکسادیا تھا۔ جب تک یہ قبیلہ یہاں رہے گا انھیں اپنے خاوندوں کے بہک جانے کا ڈر تھا۔ لاچی کے مقدمے نے قبیلے کی گندگی سطح پر اچھال دی تھی۔ اب ہر شریف آدمی اور ہر بڑا آدمی اپنی ناک پر رومال رکھے ہوئے اس کی عفونت سے بیزار نظر آتا تھا۔

یہ لوگ چور ہیں۔

ڈاکو ہیں۔

جرائم پیشہ ہیں۔

آوارہ مزاج ہیں اور کام چور ہیں۔

سوسائٹی پر بدنما دھبہ ہیں۔

یہ لوگ ہمارے علاقے میں کیوں پڑے ہوئے ہیں۔

میونسپلٹی نے آخر انھیں کیوں پناہ دے رکھی ہے۔

ریل کی پٹری ان لوگوں کی حرکتوں کی وجہ سے خطرے میں ہے۔ ان لوگوں کا دین ایمان نہیں ہے۔ یہ لوگ کسی وقت بھی دیش اور قوم کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔

دھیرے دھیرے جوں جوں مقدمہ اختتام کو پہنچتا گیا۔ ان لوگوں کا جوش قبیلے کے خلاف شدید ہوگیا۔ اپنی عفونت کو چھپانے کے لئے ہر الزام خانہ بدوشوں پر لگایا جانے لگا۔ یہ لوگ بھول گئے

کہ ہر لغزش کرنے والی عورت کے بالمقابل شریف سوسائٹی کا ایک مرد کھڑا تھا۔ لیکن یہ تمام افراد جیسے شریف گھر والے۔ نوکریوں والے یا کام کاج کرنے والے یعنی ان کے اپنے آدمی تھے۔ اس لئے سب آدمی اپنی عزت بچانے کے لئے تُل گئے۔ اور قبیلے کے خلاف غیض و غضب کا مظاہرہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ ہر سماج اپنے گناہ چھپانے کے لئے کسی باہر والے کو قربانی کا بکرا بناتا ہے۔ ذات سے باہر یا سوسائٹی سے باہر یا ملک سے باہر یا قوم سے باہر یا عقیدے سے باہر۔ اس بکرے کی ضرورت ہر سوسائٹی میں یکساں ہے اور اس بکرے کے بغیر کوئی سوسائٹی یا سماج چاہے وہ پسماندہ سے پسماندہ یا ترقی یافتہ ہو۔ چل نہیں سکتا۔ خاص خاص بحرانی کیفیتوں میں اس بکرے کی ضرورت ہمیشہ پیش آتی ہے۔ اس بکرے کی جان لے کر۔ اس کا لہو پی کر ہر سماج ایک طرح سے گویا اپنی تجدید حیات کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ انسانی تاریخ اگر ایک طرف شہیدوں کے خون سے روشن ہے تو دوسری طرف بکروں کے لہو سے بھرپور سرخ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ شہیدوں کا ذکر لوگ فخر سے کرتے ہیں۔ لیکن بکروں کا ذکر کوئی نہیں کرتا۔ اور کبھی بکروں کا ذکر ناگزیر ہو جائے تو شرم سے سر جھکا کر سرگوشیوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وجہ کہ لوگ اپنے شہیدوں کے نام تو جانتے ہیں۔ لیکن اپنے بکروں کے نہیں۔

جس دن لاچی کو سزا ہوئی۔ اور علاقہ کا منھ کالا ہوا اور مقدمہ کی ساری روداد اور جج کا فیصلہ اخباروں میں چھپا۔ علاقے کے لوگوں کی خفت بڑھنے لگی۔ دھیرے دھیرے سرگوشیاں شروع ہو گئیں لاچی کی سزا کے دس دن بعد حمید ٹیکسی ڈرائیور نے کملا کر ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

آج رات کو جشن ہے

کہاں۔؟

کملا کر نے پوچھا۔

اسٹیشن یارڈ کے اس پار۔

یہ کہہ کر حمید نے آنکھ ماری۔ کملا کر کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ لیکن جو کچھ اس نے سمجھا وہ اتنا کافی تھا کہ اسے مزید دریافت کرنے کی حاجت نہ ہوئی۔

کچھ ساتھ لیتا آؤں۔

ہاں!

اور!

اور کیا آدھی بوتل چڑھا کے آنا۔ ورنہ جشن میں لطف نہ آئے گا۔

مادھو فروش والے سے پان والے نے کہا۔

آج رات کو جشن ہے۔

مادھو چونک پڑا۔

ہوں۔

ہاں۔

کب۔

آدھی رات کو چلو گے۔

چلوں گا۔ مادھو کی بوٹی بوٹی فرطِ شوق سے کانپنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد مادھو نے پوچھا۔

اکیلا آؤں۔

اگر کوئی دوست نہ ملے تو اکیلے ہی آجانا۔ لیکن اگر کچھ لوگ ساتھ لاؤ تو بہت ہی اچھا ہوگا۔

میرے دوستوں میں دس بارہ دودھ بیچنے والے لاٹھی پھکیت بھتیا بھی ہیں۔ اگر کہو تو انھیں بھی ساتھ لیتا آؤں۔ ضرور ضرور سب کو ساتھ لیتے آؤ۔ بڑا مزا رہے گا۔

پلاسٹک مل کے مالک نے شہر کے ایک اڈے پر فون کیا۔

چنتامنی! آج ہی سب آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔

چنتامنی ہر طرح کا دھندا کرتا تھا۔ چرس کا۔ افیم کا۔ گانجے کا۔ کوکین کا قمار بازی کا۔ بُری عورتوں کا۔ شراب کا۔ قتل کا۔ بے حد شریف۔ قابلِ اعتبار اور ایماندار مجرم تھا۔ کئی بار

شہرہ عام ہو چکا تھا۔ اس لیے جرائم کی دنیا میں اس کی شرافت اور کاروبار کی دنیا میں ایمانداری مسلّم تھی۔

اس نے فون پر کہا۔

کس وقت چاہئیں مالک۔

آج رات کے دس بجے۔ اگر وہ مل کے پھاٹک پر آجائیں تو انھیں ہر طرح کی ہدایات مل جائیں گی۔

بہت اچھا مالک۔

کہہ کر چیتا مَنی نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ اور انتظام کرنے میں مصروف ہو گیا۔

جشن کا وقت قریب آنے لگا۔

شام ہوتے ہوتے۔ دھیرے دھیرے اسٹیشن یارڈ کے علاقے میں لوگ دو۔ دو۔ چار۔ چار دس بیس کی ٹولیاں میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ فضا میں جیسے بجلی مضطرب سی لہریں گھوم رہی ہوں۔ کچی سے کچی آدمی بھی ہوا سونگھ کر کہہ سکتا تھا۔

آج کچھ ہونے والا ہے۔ آج کچھ ہونے والا ہے۔

جوں جوں لوگوں کی ٹولیاں بڑھتی جا رہی تھیں پولیس والے کم ہوتے جا رہے تھے۔ گیارہ بجے تک پریمیس کا ایک آدمی بھی نظر نہ آتا تھا۔ آج سرشام ہی سے علاقے کی دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ لیکن لوگوں کی ٹولیوں سے اندازہ ہو جاتا تھا جیسے کسی میلے کا اہتمام ہوا ہو۔ گلی کے کونوں میں کسی نے کچھ کہا۔ مگر سب مبہم اور پُراسرار کوئی بات واضح اور صاف نہ تھی۔ کیوں کہ بیشتر لوگوں کو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ بس یہی معلوم تھا کچھ ہوگا۔ آج شب کو کچھ ہوگا۔ کب ہوگا۔ کیسے ہوگا۔ کس وقت ہوگا۔ کہاں ہوگا اس کے متعلق کوئی مصدقہ اطلاع نہ تھی۔ اکثر اس قسم کے موقعوں پر بھی کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ایک پُراسرار تذبذب میں رکھ کر ان کی بے چینی کو کھولتے ہوئے نقطے پر لے جا کر ان کا اضطراب کا آدھا رُیک لخت موڑ دیا جاتا ہے۔ اُدھر جدھر پلان کرنے والے چاہتے ہیں۔ آگے چل کر باب (MOB) کی نفسیات یہی کام کرتی ہے۔ بُرا ہو یا بھلا۔ اس کے بارے میں اس وقت سوچنے کی ضرورت

کیسے ہوتی ہے۔ صرف سوچنے والوں نے پہلے سوچا ہوتا مطلب یہ شامل ہونے والے لوگ بعد میں سوچا کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے پہلے سے سب کچھ سوچا اور سمجھا ہوتا ہے وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ یہ بعد میں سوچیں گے جب بہت دیر ہو جائے گی اور پہلے سے سوچنے والوں کا کام بن چکا ہوگا۔

کوئی دس بجے کے قریب چنتامنی اپنے آدمیوں کو لے کر مل کے پھاٹک پر پہنچ چکا تھا۔ یہاں پر اسے جو ہدایات ملیں وہ یہ تھیں۔ کہ وہ اپنے آدمیوں کو شراب پلائے۔ اسے اس کام کے لئے پیسے بھی دیئے گئے۔ اس کے بعد شراب پلانا کیا مشکل تھا۔ قریب ہی درختوں کے جھنڈ میں سامنے جو چھپر نما گھر تھے۔ ان میں دیسی شراب کی کشید ہوتی تھی۔ جس سے کارخانہ میں کام کرنے والے لوگ کبھی کبھی اپنے تھکے ہوئے اعضا کو سکون پہنچایا کرتے تھے۔ یہ لوگ دس سے بارہ بجے تک ان چھپروں میں بیٹھے شراب پیتے رہے تلی ہوئی مچھلی اور کباب کھاتے رہے۔ شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اور لوگوں کی گفتگو کا دھارا سمندر کی طرح موجیں مار رہا تھا۔

جب عقل سلیم کے سارے اجزا الکحل میں حل ہو گئے تو چنتامنی کو دوسری ہدایت ملی۔ اور روپیہ بھی اس کی جیب میں پہنچا دیا گیا۔

چنتامنی اپنے قابل اعتماد لفٹیننٹ سورج کو چھپروں میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ تین آدمی اس نے اپنے ساتھ لئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب واپس آیا تو ان لوگوں کے پاس مٹی کے تیل کے بڑے بڑے پیپے تھے۔ اور آگ لگانے کا ضروری سامان تھا۔

رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب آخری میل اسٹیشن سے گزر گیا۔ اور اس کے بعد آنے والی گاڑی تین گھنٹے کے بعد آتی تھی۔ اس وقت اسٹیشن یارڈ کے دوسرے سرے سے آگ کے شعلوں کا لپکا سا بلند ہوا۔ اور کسی نے چلا کر کہا۔

خانہ بدوشوں کے خیموں میں آگ لگ گئی۔

پھر اسی وقت حمید نے چلا کر کہا۔

یا علی۔

مادھو کی ٹولی لاٹھیاں اُٹھا کر دوڑی۔ اور ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتے ہوئے اسٹیشن کے اندر بلا ٹکٹ گھس گئی۔ اور ریل کی پٹریاں پار کرتے ہوئے خانہ بدوشوں کے قبیلے کی طرف بڑھنے لگی۔

لوگ لاٹھیاں گھماتے اور چاقو کھولے دوڑ رہے تھے لوہے کے جنگلے سے سلاخیں نکال لی گئیں۔ چھپروں سے لکڑیاں نکال لی گئیں۔ ہر شخص کے منہ سے شراب کی بو آتی تھی۔ آنکھوں میں درندوں کی سی چمک تھی۔ اور ٹانگوں میں بھیڑیئے کی سی تیزی تھی۔ اور نتھنے پھولے ہوئے۔ شکار کو سونگھتے ہوئے۔ دو منٹ میں اپنی تہذیب کے سارے پردے چاک کر کے انسان جنگل کی فضا میں پہنچ گیا تھا۔ اور چوکڑیاں بھرتا ہوا شکار کی تلاش میں دوڑا جا رہا تھا۔ وہ لوگ کون تھے۔ ان سے ان کی کیا دشمنی تھی۔ ان لوگوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ یہ سب خیال اس وقت دب گئے تھے۔ صرف ایک منزل سامنے تھی۔

شکار۔

شکار۔

شکار۔

جنگل کا خون پکار رہا تھا۔

گل پل پر سے دیکھ رہا تھا۔

خانہ بدوشوں کے خیموں سے بھرے ہوئے میدان کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔ ان کے خیموں میں آگ لگائی جا رہی تھی۔ خانہ بدوش بڑی جیداری سے لڑ رہے تھے۔ لیکن وہ لوگ تعداد میں بہت کم تھے۔ اور حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ حملہ اچانک ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں ہوا تھا۔ اس لئے خانہ بدوشوں کی بستی میں ہراس پھیل گیا تھا۔ خانہ بدوش کے بچے چیخ رہے تھے۔ خانہ بدوش عورتیں اِدھر اُدھر بھاگی پھر رہی تھیں۔ اور اپنی اپنی مدافعت میں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھیں۔ گل پل پر سے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک عجیب سی حسرت اس کے دل سے اُٹھی۔

پراس کے دشمنوں کا قبیلہ تھا۔ پھر بھی اس کی لاچی کا قبیلہ تھا۔ وہ لاچی جو اس کی وجہ سے جیل میں تھی۔ اسی قبیلے میں اس کے ماں باپ تھے۔ بہت بوڑھے بیحد بوڑھے پھر بھی اس کی لاچی کے ماں باپ تھے۔

وہ پُل پر کھڑا کھڑا کانپنے لگا۔

اور پھر دوسرے لمحے میں تیز تیز قدموں سے نیچے میدان کی طرف چلا گیا۔ لیکن گل وہاں کیا کرسکتا تھا۔ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اور گل اکیلا تھا۔ اکیلا آدمی کتنے آدمیوں سے لڑ سکتا ہے۔ جب لاٹھی کا ایک اوچھا وار اس کی ٹانگ پر پڑا وہ کونے میں گر گیا اور چکرا کر اندھا ہو گیا۔ اگلے چند لمحوں میں دو چار قدم اس کے جسم کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اسے ان قدموں کے بوجھ کا اتنا احساس نہ تھا۔ جس قدر اپنی ٹانگ میں درد کا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا واپس پُرانے پل کو ہولیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ پولیس کو فون کرے۔ لیکن اب اسے یہ سب کچھ بیکار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس بلندی سے اس بستی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ جہاں انسان بستے تھے۔

خانہ بدوشوں کے خیمے جل رہے تھے۔

لوگ مشعلیں اٹھائے خانہ بدوشوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ بہت سے خانہ بدوش اور ان کی عورتیں بھاگ گئی تھیں۔ بچے ڈرے ہوئے۔ سہمے ہوئے اور ڈر رہے تھے۔ اور معصومیت میں حملہ آوروں سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

ایک غنڈے نے ایک خانہ بدوش عورت کو پکڑ لیا۔ اور وہ چاقو سے چیر چیر کر اس کے کپڑے اُتار رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ سے بھی اس کے کپڑے اُتار سکتا تھا۔ مگر شاید اسے چاقو سے چیرنے میں زیادہ مزہ آ رہا تھا۔ وہ ایک ایک کپڑا چیر کر خانہ بدوش عورت کو ننگا کر رہا تھا۔ ہوتے ہوتے اس خانہ بدوش عورت کے گرد شخصوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ وہ لوگ شراب کی بوتلیں منہ سے لگائے خوشی سے ناچ رہے تھے۔ گل نے اپنے ہاتھ۔ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے پھر دوڑتا ہوا اسٹیشن یارڈ سے باہر نکل گیا۔ اور سیدھا پولیس چوکی کی طرف چلا گیا۔ مگر پولیس کے آنے سے

پہلے غنڈوں کو خبر ہو چکی تھی۔ اور جب تک پولیس آئے غنڈے اپنا کام کر کے وہاں سے جا چکے تھے
چنانچہ جب پولیس واردات کے موقعہ پر پہنچی تو اسے ایک مجرم بھی نہ ملا۔
میدان صاف تھا۔
خانہ بدوش کے خیمے جل رہے تھے۔
پانچ چھ خانہ بدوش سخت زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے تھے۔
ٹوٹی ہوئی صراحیاں۔ گھڑے۔ تسلے۔ ایلومونیم کے برتن میدان میں بکھرے پڑے تھے۔
چھوٹے چھوٹے بچے مختلف کونوں میں چھپے ہوئے سسک سسک کر رو رہے تھے۔ بچے جن کی آنکھوں کے سامنے اُن کی ماؤں کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ اُن کے باپوں کو مارا پیٹا گیا۔ شیطان کے چیلے درندگی اور بربریت کا رقص تمام کر کے وہاں سے جا چکے تھے۔ مظلوم وہاں موجود تھے۔ لیکن مجرم کہیں نظر نہ آتا تھا۔
پولیس فوراً بیانات قلم بند کرنے لگی۔ سپاہی سنتری ناکوں اور علاقے کے کوچوں میں گشت کرنے لگے۔ چند لوگ گرفتار بھی کیے گئے۔ لیکن ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو اس واردات میں شامل نہ تھے۔ بلکہ اپنے گھروں میں سوئے ہوئے تھے۔ اور جنھیں اس واقعے کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔
بکرے۔
دوسری صبح کو خانہ بدوشوں کا قبیلہ وہاں سے جا چکا تھا۔ میدان خالی تھا۔ وہاں چند جلے ہوئے خیمے اور چند گڑھے اور کچھ قدموں کے نشان۔ دس بارہ روز میں یہ بھی مٹ جائیں گے اور وہاں خونچکاں داستان کا کوئی نشان بھی نہ رہے گا۔
خانہ بدوش اسٹیشن کے علاقے کو خالی کر گئے۔ ہمیشہ کے لئے۔ اب وہ پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ خدا جانے وہ کدھر جائیں گے اور کہاں اپنا ڈیرہ جمائیں گے۔ مگر وہ اس علاقے میں واپس نہ آئیں گے۔ علاقے کے لوگوں نے اس بدنما دھبے کو ہمیشہ کے لئے اپنے

علاقے سے ہٹا دیا تھا۔ اور اب علاقہ میں کسی طرح کی بے اطمینانی نہ تھی۔ دوسرے دن دوکانیں بڑے اطمینان سے کھلیں۔ لوگ باگ آنے جانے لگے۔

پان والے۔

فروٹ والے۔

ٹیکسی والے۔

سب اپنے اپنے گاہکوں کی مانگ پوری کرنے میں مصروف تھے آگ لگانے والے بس کے کیوُ میں کھڑے ہو کر اپنے گھر کے لئے تھیلیوں میں کچھ لے جا رہے تھے۔ جن لوگوں نے کل رات خانہ بدوش عورتوں کی بے حرمتی کی تھی وہ اس وقت سبز پتوں میں پھولوں کی وینیاں لئے ہوئے اپنی عورتوں کے لئے لے جا رہے تھے۔ زندگی بالکل ٹھیک تھی۔ اور درست تھی اور صحیح تھی۔ اور بالکل اسی طرح تھی جس طرح اسے ہونا چاہئے تھا۔ صرف گل کو کچھ کچھ عجیب سا معلوم ہوا تھا۔ اور جب ملاقات کے دن اس نے لاجی سے مل کر یہ سب کہا تو اس کا دل تڑپنے لگا۔ اور اس کے دل میں ایک نامعلوم سڑک یاد آئی۔ جو پہاڑوں اور میدانوں اور وادیوں میں سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور جس پر خانہ بدوشوں کا قافلہ کسی موہوم منزل کی تلاش میں ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔

اس نے گھبرا کر گل کے سینے پر سر رکھ دیا۔

اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بارہواں باب

خوب چند نے منع کر دیا تھا پھر بھی لاچی کی تصویر کی بات آہستہ آہستہ ساری جیل میں پھیل گئی۔ عورتوں کی جیل میں جب اس بات کا پتہ چلا تو بہت ساری عورتیں جیناں بائی کے توسط سے لاچی کو دیکھنے کے لئے آنے لگیں۔ اور اس سے دوستی کی خواہش ظاہر کرنے لگیں۔ ان میں مشہور قلم اسٹار دل آرا بھی تھی۔ جسے دھوکا دینے کے جرم میں ساڑھے تین سال کی قید کی سزا ہوئی تھی۔ دل آرا کا قد لاچی کے قد سے بھی لانبا تھا۔ جلد آئینے کی طرح شفاف تھی۔ رخساروں پر گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں کنول کی سی پاکیزگی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عورت کسی طرح کا دھوکا کر سکتی ہے۔ اس لئے جب وہ پہلی بار لاچی کو اس کے جرم کی تفصیل سن کر بڑا اچنبھا ہوا۔ وہ اس وقت سرکل کے میدان میں بیٹھ کے نیچے گھاس چھیل رہی تھی۔ جب جیناں دل آرا کو اس کے پاس چھوڑ گئی۔ تو دونوں عورتیں کھرپے کر گھاس چھیلتے چھیلتے باتیں کرنے لگیں۔

لاچی نے مسکرا کر کہا۔

تم تو ایسی لگتی ہو کہ تم سے دھوکا کیا جا سکتا ہے تم کسی کو دھوکا نہیں دے سکتیں۔

دل آرا ہنس کر بولی۔

نہیں میں نے تو واقعی دھوکا دیا تھا۔ وہ سندھی سیٹھ بڑا چالاک بنتا تھا۔ میں نے اس سے

تیس ہزار روپے اینٹھ لئے۔

کاہے کے لئے۔

مجھے روپوں کی ضرورت تھی۔

لاچی کو اپنی بات یاد آئی۔

دوست بے روپوں کی ضرورت یوں تو ہمیشہ رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بڑی رقم کی ضرورت بھی پڑ جاتی ہے۔ ایک معمولی سی رقم کے لئے اس نے خون کر دیا تھا۔ اب تیس ہزار کے دھوکے میں کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ضرور کوئی اہم معاملہ ہوگا۔ جبھی تو اس عورت نے اتنا بڑا دھوکا کیا۔

لاچی

اس نے پوچھا۔ تم فلم میں کام کر کے کتنا کما لیتے ہو۔

میں پندرہ بیس ہزار روپے مہینہ کما لیتی ہوں۔

پھر تم نے تیس ہزار روپے کا دھوکا کیوں کیا۔

میں ایک گاڑی خریدنا چاہتی تھی۔ ایک بھارا جہ اسے ساٹھ ہزار روپے میں دے رہا تھا۔ اور وہ ایسی پیاری گاڑی تھی کہ ساٹھ ہزار میں بھی سستی تھی لیکن اتنی رقم میرے پاس نہ تھی۔ اور یہ سندھی سیٹھ ایک عرصہ سے میرے پیچھے پڑا تھا۔ میں نے اسے بے وقوف بنایا۔

ایک گاڑی کے لئے۔ کیا تمہارے پاس اس سے پہلے کوئی گاڑی نہ تھی دو تھیں۔ مگر میں تو یہ نئی والی گاڑی لینا چاہتی تھی۔ اور تم دیکھو گی اسے۔ تو جان نکل جائے گی۔ کیسی پیاری سوئٹ گاڑی ہے۔ سلور گرے۔

دل آرا نے کھرپی چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ فرط مسرت سے اپنے سینے پر رکھ لئے اس کی ہتھیلیوں میں سلور گرے گاڑی چمک رہی تھی۔

لاچی بہت دیر تک کچھ نہ بولی۔

وہ سر جھکائے کھرپی سے گھاس کھودتی رہی۔

اس کی بہنیں تھیں پُرلنے رسم و رواج میں جکڑی ہوئیں۔ غربت اور بھوک اور جہالت کا شکار۔ اگر وہ عورتیں چوری کرتی تھیں۔ دھوکا کرتی تھیں تو یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ یہ ایک نئی گاڑی کے لئے دھوکا دینے کی بات لاچی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور جب کسی کے پاس دو گاڑیاں پہلے سے موجود ہوں۔ لاچی نے نگاہ اٹھائی۔ دل آرا کو دیکھا کتنی پیاری خوب صورت سی لڑکی تھی۔ یقیناً کوئی موٹر اس سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتی انسان ایک بڑھیا خوب صورتی کو بیچ کر ایک گھٹیا خوب صورتی کیوں مول لیتا ہے۔ یہ کیسا سودا ہے۔

یکا یک لاچی نے غصّے سے کہا۔

تمہیں ایک ذلیل لوہے کی گاڑی کے لئے دھوکا دیتے شرم نہ آئی۔

دل آرا نے لاچی کی طرف بڑے اطمینان سے دیکھا۔

اسے ذرا غصّہ نہیں آیا۔ پھر وہ ذرا مُسکرائی۔ مگر جب تک اس نے لاچی کی آنکھوں سے ایمان اور صداقت کے شعلے نکلتے دیکھے تو وہ ان کی چمک کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی آنکھیں نیچی جھک گئیں۔ وہ گھاس کی جڑ سے مجبوری مٹی جھاڑتے ہوئے بولی۔ میں جب سات سال کی تھی تو پہلی بار بیچی گئی تھی۔ خود میرے ماں باپ نے مجھے آٹھ سو روپوں میں بیچ دیا تھا۔ تم یقین نہیں کرو گی۔

کر سکتی ہوں۔ لاچی بولی۔ ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے۔ خود مجھے ہو چکا ہے۔

سات سال سے سترہ سال تک میں دس بار بیچی گئی ہوں۔ ہر سال میرا باپ بدل جاتا تھا ہر سال میرا ایک نیا خریدار۔ مجھے خریدتا تھا۔ ہر سال میری قیمت بڑھ جاتی تھی۔ کیوں کہ میں بہت خوب صورت ہوں نا!

ہاں تم بہت خوب صورت ہو۔ لاچی نے کہا۔ بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہو۔

دل آرا بولی۔

جب میں چھوٹی تھی تو میرے خریدار میرے ماں باپ بن جاتے تھے۔ جب میں بڑی ہوئی تو وہی میرے شوہر ہونے لگے۔ جب میں فلم میں آئی تو کوئی ماں نہ رہی کوئی باپ نہ رہا کوئی شوہر نہ بھائی

دل آرا نے چونک کر پوچھا۔ کیا بات ہے۔

ادھر ایک پروڈیوسر تم سے ملنے کے لئے آیا ہے۔

دل آرا نے کھرپی چھوڑ دی۔ روش کے کنارے لگے ہوئے پانی کے نل سے ہاتھ دھوئے اور چیناں بائی کے ساتھ کالی چرن کے دفتر کو چلی گئی۔

کالی چرن کے دفتر میں حاجی عبدالسلام اور میر جینداتی دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ دل آرا اندر آ کر میر جینداتی کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اور اس کے سگریٹوں کے ڈبے میں سے ایک سگریٹ نکال کے پینے کے لئے اپنے منہ میں لگا لیا۔ حاجی اور میر جینداتی دونوں نے اپنے لائٹر جلا دیئے۔ اور آگے بڑھائے دائیں بائیں دل آرا کے سامنے دو لائٹر تھے۔ دل آرا نے دونوں طرف دیکھا۔ پھر اس نے حاجی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور میر جینداتی کے لائٹر پر جھک گئی۔ ایک لمحے کے بعد اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے دھوئیں کے نازک نازک مرغولے نکلنے لگے۔ حاجی دل آرا کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے لئے رات دن آہیں بھرتا تھا۔ وہ اس کے لئے بیس ہزار روپے تک خرچ کرنے کے لئے تیار تھا۔ مگر دل آرا سے جب بات کرو۔ ایک لاکھ کی بات کرتی تھی۔ اب یہ محبت ہے حاجی نے سوچا۔ بزنس تو ہے نہیں کہ آدمی ایک لاکھ چھوڑ کر دس لاکھ کا جوا بھی کھیل جائے۔ بزنس میں رسک تو لینا پڑتا ہے۔ لیکن محبت میں اتنا رسک کون مول لے۔ اب پندرہ بیس ہزار کی بات ہو تو خیر چلئے۔ اس رقم کو دل آرا پر قربان کر دیتا۔ مگر یہ کم بخت تو محبت کو بزنس بنائے بیٹھی تھی۔ اسے یہ کون سمجھائے کہ محبت محبت ہے اور بزنس بزنس ہے۔ بزنس کو بزنس کے طریقے پہ چلانا چاہیئے اور محبت کو محبت یعنی تفریح کے انداز میں دیکھنا چاہیئے۔ کوئی اور مل جائے گی دنیا میں عورتوں اور محبتوں کی کیا کمی ہے۔

اور میر جینداتی تو ایک پیسہ دلوال نہ تھا۔ اسے دل آرا سے محبت ہی نہ تھی وہ اسے ایک خوش ذوق انسان کی نظر سے دیکھتا تھا۔ چند خوش گوار لمحوں کا ساتھ دینے والی ساتھی! دونوں

دلال بن گئے۔ کیا یہ دھوکا نہیں! اور اخلاق کیا ہے۔ اس کا مجھے پتہ نہیں!

مگر مجھے معلوم ہے۔ لاچی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں۔

گھوڑیاں آہستہ آہستہ چلتی رہیں۔

پھر لاچی نے پوچھا۔ کیا میں فلم اسٹار بن سکتی ہوں۔

ذرا کھڑی ہو جاؤ۔ دل آرا نے اشارہ کیا۔

لاچی گھڑیا پھینک کر پیڑ کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے سامنے دل آرا کھڑی ہو گئی اور شاق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

ارے تم تو لوٹ کے کھا جاؤ گی۔

لاچی ہنستے ہوئے بولی۔ حمیدا بھی یہی کہتا تھا۔

کون حمیدا۔

ایک ٹیکسی والا ہے اُدھر اسٹیشن پر۔

ہونھ۔ دل آرا نے بڑی حقارت سے کہا۔ وہ ٹیکسی والا تمھیں فلم اسٹار کیا بنائے گا۔

میں بنا سکتی ہوں۔ سچ! اگر اس کے لئے مجھے کیا کرنا پڑے گا۔ لاچی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

سب سے پہلے تمھیں اپنی عزت دینی ہو گی۔

لاچی خفا ہو کر پیڑ کے نیچے بیٹھ گئی۔

تم بھی دل آرا! تم بھی یہی کہتی ہو۔ پھر تو یہ جیل اچھی۔ لاچی نے بڑے استقلال سے کہا۔ اور گھرلی چلانے لگی۔

اتنے میں چیتاں بائی دوڑتی ہوئی آئی اور دل آرا سے کہنے لگی۔

چلو اُدھر دفتر میں۔ کانی جرن صاحب نے تمھیں بلایا ہے۔

کو برج کا بہت شوق تھا۔ اچھے سگریٹوں کا۔ اچھے کپڑوں کا۔ اچھی موٹروں کا۔ اچھی شراب کا۔ عورت اور مردوں کے تعلقات تو میر جیدانی کے لئے ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ عورتیں میر جیدانی کو صرف اس لئے اچھی لگتی تھیں کہ وہ خوش وقتی کا ایک بہت بڑا سہارا تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ان کے بھولے بھالے روغنی چہرے۔ رنگین ساڑیوں کسے ہوئے جسم اور احمقانہ فقرے کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ آدمی ایک دم سے بازار بلیک مارکیٹ۔ فریب دہی اور چار سو بیس کی انتہائی زیرک دنیا سے نکل کر ایک دم معصوم۔ نرم ملائم اور شیریں دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ بزنس مین ——— کے لئے دن بھر کی جان لیوا محنت اور تھکن کے بعد عورت ایسی ہی ضروری ہے جیسے سر درد کے لئے اسپرو یا اناسین! یا کوئی بھی اس طرح سفید رنگت کی خوب صورت ٹکیہ۔ شفاف چکنے کاغذ میں لپٹی ہوئی۔ عورت اور سر درد کی ٹکیہ کی پیکنگ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کم سے کم میر جیدانی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ دل آرا اس سے پورا اتفاق کرتی تھی۔ جس طرح اس کی زندگی گزری تھی۔ جس طرح وہ بیچی گئی اور خریدی گئی تھی۔ سماج کے بازار میں بار بار اس کا سودا کیا گیا تھا اسے مد نظر رکھتے ہوئے دل آرا کا دل میر جیدانی کے خیالات کی سو فیصدی تائید کرنے پر مجبور تھا۔

اس نے سگریٹ سلگا کر اپنی بے حد متناسب کلائی میر جیدانی کے شانے پر رکھ دی اور بڑی معصوم مسکراہٹ سے حاجی جی کی طرف دیکھ کر بے پروائی سے بولی۔

حاجی چاچا کیا پروگرام ہے۔

کیوں سب کا لیے تو نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ حاجی کی طرف سے پلٹ کر اس نے کالی چرن کو اپنی نگاہوں کا شکار کیا۔

مردوں کی دنیا میں عورت ہر وقت تیر کمان سے لیس رہتی ہے۔ بے چاری کیا کرے اس کے قلب و جگر میں نظروں کے نشتر نہ چبھے تو وہ اسے دن رات ایسی مراعات کیوں کر دیگا۔ کالی چرن کا دل دل آرا کو دیکھ کر کھسپنے لگتا تھا۔ دل آرا کو خوب معلوم تھا کہ وہ کیوں کا پتا

تھا۔ اور کیا پا بتا تھا۔ جس دن اس کی چاہت پوری کر دی گئی اس کا دل نہ کانپے گا نہ چاہے گا۔ وہ غرور سے گردن اونچی کرے گا۔ فخر سے دُنیا کو دیکھے گا۔ اور تحقیر سے دل آرا کو۔ اس لئے یہی بہتر ہے اس خبیث کو سالیہ کہا جائے۔ اور کبھی کبھی جب وہ بہت جھنجھلانے لگے تو اسے سو پچاس روپے رشوت میں دے دیئے جائیں۔ کیوں کہ کالی چرن تو سراپا لالچی تھا۔ اگر تم اس کی ہوس پوری نہیں کر سکتے تو اس کی حرص کی آگ ہی بجھا دو۔ اس کے لئے بہت سے جذبے متبادل تھے۔ اور آخر میں سب روپے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عورت کی محبت۔ ماں کی ممتا۔ باپ کی بیماری۔ قیدی کا پیرول۔ عاشق کی مجبوری وہ سب کی طرف چند لمحوں کے لئے تعریفی نگاہوں سے دیکھتا۔ گویا ہر جذبے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کا وزن کرتا۔ اور آخر میں اس پر روپے کا لیبل لگا دیتا۔ اس جذبے کے اتنے پیسے اور اس رعایت کی اتنی قیمت چکا دو۔ کالی چرن تمہارا ہے۔

حاجی عبدالسلام بولے۔ آج بہت دنوں کے بعد دلدار روڈ پر جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ گانا سنیں گے۔

دل آرا تو ایسے کاموں کے لئے تیار رہتی تھی۔ فوراً بولی۔ اسے مزا آجائے گا۔ لکھنؤ میں دو سال میں بھی کوٹھے پر بیٹھی ہوں۔ واہ وا۔ کیا دن تھا وہ۔ مجھے پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔ ایک ٹھمری میں بھی گاؤں گی۔

تو تم میرے ساتھ چل رہی ہو نا۔

حاجی عبدالسلام نے پکا کرتے ہوئے کہا۔

دل آرا نے مُڑ کر میر چندانی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

تم نہیں جا رہے ہو۔

میر چندانی بولا۔ میں سوچ رہا تھا۔ آج میں رات کو اپنی بھابی کی بہن کی دیورانی کی بھانجی کی موسی کے یہاں ہو آتا۔

ارے وہی نارتھ روڈ والی اینگلو انڈین کم بخت تمہیں تم نہیں جا سکتے اور اگر تم گئے

تو میں سپرنٹنڈنٹ جیل کو رپورٹ کردوں گی - مجھے ایک ہفتہ ہوا ہے جیل سے باہر نکلے ہوئے۔
تم کیا چاہتے ہو۔ میں یہیں گھسٹ گھسٹ کے مرجاؤں؟

میر چندانی نے سر جھکا دیا۔

بولا۔

بہت اچھا میڈم - آج گانا سننے چلیں گے - جہاں کہو گی وہیں چلیں گے۔

حاجی کا منہ اتر گیا۔

اس نے میر چندانی سے مل کر پروگرام بنایا تھا کہ میر چندانی تو وار لنگ روڈ پر اپنی اینگلو انڈین دوست کے پاس جائے گا۔ اور حاجی دل آرا کو وزارت روڈ پر گانا سننے لے جائے گا مگر اس کم بخت دل آرا نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ اب یہ کم بخت جہاں جائے گی میر چندانی کی بغل میں بیٹھے گی۔ اسے کیا مزہ آئے گا۔ خاک ا بڑی مشکل ہے اس نے کالی چرن کو ۔۔ دو روپے دے کے آج رات کا یہ پروگرام بنایا تھا مگر ــــ

تو تو پھر میرا کیا ہو گا۔

بے بسی سے حاجی نے کہہ ہی دیا۔

گھبراؤ نہیں چاچا جی! تمہارے لئے کوئی بندوبست کرتے ہیں۔

کون۔

لڑکی۔ دل آرا بولی۔

لڑکی - حاجی نے پوچھا - عورت ہے وہ!

عورت نہیں ہے۔ ڈاؤنا منٹ ہے۔ میر چندانی نے آہستہ سے کہا۔ پھر اس نے سگریٹ کے لئے ایک ماچس کی تیلی روشن کی اور دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ ماچس بجھ گئی اور سگریٹ جوں کا توں اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

کالی چرن نے کھانس کر کہا۔ میں نے سمجھا تھا آپ صرف تینوں ہی جائیں گے - اب

ایک اور بڑھ گیا تو مجھے ایک وارڈرن اور آپ لوگوں کے ساتھ کرنا پڑے گا۔ دوسو روپے اور ہوں گے۔ میر چندانی نے جیب سے دوسو روپے کے نوٹ نکال کر کالی چرن کو تھماتے ہوئے کہا۔ یار تم استے پیسے لیتے ہو کہ رنڈی بھی مجرا کرنے کے نہ لیتی ہوگی۔

کالی چرن نے گھنٹی بجا کر چپراسی سے کہا۔ جیناں بائی کو بلاؤ۔

طے یہ ہوا کہ دل آرا تو جیل سے سرکاری طور پر جائے گی کسی فرضی پروڈیوسر کی شوٹنگ پر۔ وہ نو بجے چلی جائے گی۔ دس بجے کے بعد جب پہرہ بدلے گا تو ایک کالی گاڑی جیل کے باہر میر چندانی۔ حاجی عبدالسلام اور لاچی کا انتظار کرے گی۔ تین وارڈرن ان تینوں کے ساتھ ہوں گے۔ اور دو وارڈرن دل آرا کے ساتھ۔ صبح پانچ بجے یہ لوگ پہرہ بدلنے سے پہلے آ جائیں گے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔

دل آرا نے لاچی کو منا لیا تھا۔

اور لاچی اس لئے مان گئی تھی کہ اس نے آج تک کسی طوائف کا کوٹھا نہ دیکھا تھا۔

دل آرا لاچی کو سمجھا بجھا کر رات کو نو بجے جیل سے رخصت ہوگئی باہر سبز رنگ کی ایک گاڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دل آرا نے گاڑی آگے بڑھوا کے جیل کے غربی کونے پر رکوا دی۔ اور باقی لوگوں کا انتظار کرنے لگی۔

دس بجے کے قریب حاجی کی سیاہ کیڈیلک میں حاجی۔ میر چندانی لاچی اور تین وارڈرن لدے آ پہنچے۔

دل آرا نے سبز گاڑی چھوڑ دی۔

گاڑی میں جگہ نہ تھی۔ چھ آدمی اس میں پہلے سے لدے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ اطمینان سے کیڈیلک کے اندر آ کر میر چندانی کی گود میں بیٹھ گئی اس کے ساتھ دو وارڈرن بھی تھے۔ اس لئے ایک وارڈرن کو آگے بٹھا دیا گیا۔ اور دوسرے وارڈرن کو جگہ دینے کے لئے دل آرا نے لاچی سے کہا وہ حاجی کی گود میں بیٹھ جائے۔

ناں میں نہیں بیٹھوں گی کسی کی گود میں۔

ڈولی ٹھنکتے سے چلائی۔

ارے چند منٹ کی تو بات ہے۔ دل آرا نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ گاڑی میں جگہ کم ہے۔ اس لئے کہہ رہی ہوں۔ اور ایڈی کیٹ بھی یہی کہتا ہے۔

بھاڑ میں جائے تم لوگوں کا ایڈی کیٹ۔ ڈولی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس موٹی بھینس ماسی کی گود میں تو تمہارا دادا جان بھی نہ بیٹھے گا۔

جب ڈولی کسی طرح نہ مانی تو دادا، ڈیرن بے چارہ بڑی تنگی سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی ریلوے روڈ کو روانہ ہوئی۔

تیرہواں باب

دلدار روڈ پر عجب طرح کا بازار تھا۔ ایک طرف عورتوں کے کوٹھے تھے۔ دوسری طرف لکڑیوں کے ٹال تھے۔ اور پرانے زنگ آلود لوہے کے ٹکڑوں کی دکانیں۔ یہاں ہر طرح کی عورتیں اور ہر طرح کی لکڑیاں بیچی جاتی ہیں۔ لانبی، چھوٹی، سستی، مہنگی ہر قسم کی لکڑی یہاں ملتی تھی۔ بانس کی۔ ببول کی ساگوان کی اور شیشم کی لکڑیاں جنہیں دیمک چاٹ گئی تھی۔

عورتیں جنہیں جنسی بیماری نے کھا لیا تھا۔

کھلے کواڑوں کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی گاہکوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ نالیاں پیشاب کی بو اور شرابیوں کی قے سے اٹی ہوئی تھیں۔ اور ان پر چمیلی کے پژمردہ پھول تیر رہے تھے۔ اور فضا میں طبلے کی تال اور سارنگی کی لے پر جلی بھنی ٹھمریاں اور سستے فلمی گانے مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے۔ اور ان سب کے اوپر تاریک گلیوں کا اندھیرا ایک گناہ گار گہرے کی طرح چھایا ہوا تھا۔ یہ عورتیں، انسان ہیں کہ لکڑی کی کھپچیاں۔ یہ دلال آدمی ہیں کہ لوہے کے زنگ آلودہ پترے۔ یہ زندگی کے بیتے جا گئے گیت ہیں کہ جنم اور موت کے نوحے یہ ایسی دنیا کا بازار ہے جسے زندہ انسانوں کی بستی کہا جائے گویا گم شدہ روحوں کی وادی۔ ایک لمحے کے لیے انسان یہ بھی بھول جاتا ہے کہ ایسی دنیا ہے جہاں معصوم بچے ماؤں کی گود میں ہمکتے ہیں۔ جہاں ماتھے پر گوگھٹ کاڑھے ہوئے سیندور کا ٹیکہ لگائے ہوئے پاکباز عورتیں تھالی میں کھانا

پرزش کراپنے تھکے ہوئے شوہروں کے سامنے رکھتی ہیں اور ان کی نظریں فرطِ حیا سے جُھک جاتی ہیں۔

یکایک لاچی کو احساس ہوا جیسے ہر کوٹھے پر وہی گا رہی تھی۔ وہی ناچ رہی تھی وہی بک رہی تھی۔ اور یہ صرف خالص مردوں کی تہذیب تھی۔ مردوں نے عورتوں کو چہار دیواری میں دھکیل دیا تھا۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے یہ بُلند و بالا۔ اُونچے محلوں۔ ہوائی جہازوں اور راکٹوں کی تہذیب بنائی تھی۔ یہ چاند کے دل تک پہنچنے والے لوگ کیا کبھی عورت کے دل تک بھی پہنچ سکیں گے۔

لاچی نے غصّے سے تھوک دیا۔ بولی۔

مجھے واپس جیل لے چلو۔

ابھی تو رات جوان ہے پیاری۔ حاجی نے لاچی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

حاجی کے اندر وسکی کے چار پیگ جا چکے تھے۔ اور وہ بالکل اسی طرح محسوس کرتا تھا جس طرح مرد چار پیگ پینے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ لاچی نے اپنی بانہہ اس سے چھڑانی چاہی نرمی سے۔ احتیاط سے۔ شرافت سے اور تہذیب کے ساتھ۔ مگر حاجی نے اسے زبردستی کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور کہا۔ لو پیو۔

لاچی نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور پھر اس کے سر پر اُنڈیل کر بولی۔ سور کے بچے! حرامی!!

میر چندانی نے غصّے میں آ کے لاچی کے منہ پر ایک چانٹا رسید کیا۔ لاچی اک دم غصّے سے اُٹھی۔ اس نے میر چندانی کی گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ اور جب حاجی اس کی مدد کو اٹھا تو اس نے پینترا بدل کر اُسے بھی چت کر دیا۔ اور پھر دونوں کی چھاتی پر چڑھ کر دونوں کے سروں کو ایک ایک دوسرے سے طبلے کی طرح بجانے لگی۔

اور زور زور سے چلانے لگی۔ تاک دھنا دھن تھیا!

تاک دھنا دھن۔ تاک دھنا دھن

تاک ...... تاک

میر جنڈانی اور حاجی پہنچ گئے۔

تھوڑی دیر میں بھگدڑ مچ گئی۔ لاچی اور وارڈرن اور گاہک اور طبلچی اور سارنگی والے ہیر سول والے اور خوشبو دار عطر والے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے اور سب کے بیچ میں لاچی ایک جھلائی ہوئی شیرنی کی طرح وار کر رہی تھی۔ اس کو مار۔ اس کو میچ۔ اس کو گرا۔ اس کے بال کھسوٹ۔ اس کا منہ نوچ کر ایک وحشیانہ خوشی سے چیخ رہی تھی اور ناچ رہی تھی۔ تاک دھنا دھن تھیا۔

پولیس دھب دھب کرتی مختلف زینوں سے اندر آگئی۔ انسپکٹر۔ سب انسپکٹر۔ حوالدار اور سنتری چند منٹ کے بعد سکون ہو گیا۔ پولیس نے سب کو گرفتار کر لیا۔ وارڈرن نے سنتریوں کے کان میں بہت کھسر پھسر کی۔ مگر اُن کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

حوالدار بولا۔ جو کہنا ہے چوکی پہ چل کر کہو۔

جب سب لوگ حوالات میں بند کر دیئے گئے تو ایک وارڈرن نے کہہ سن کر اسسٹنٹ جیلر کالی چرن کو فون پر بلایا۔ کالی چرن پسینے میں تر بتر دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اگر معاملہ پولیس نے نہ دبا دیا تو وہ برخاست تو کیا ہو گا۔ شاید اسے جیل بھی ہو جائے۔

انسپکٹر اور ڈپٹی جیلر منہ جوڑ کر بیٹھے۔ اور کالی چرن نے حاجی اور میر جنڈانی سے ملاقات کی۔ پھر ہاتھ ایک جیب سے دوسری جیب میں گئے۔ دوسری جیب سے تیسری جیب۔ جب جا کے کہیں گلو خلاصی ہوئی۔ اور کیسے نہ ہوتی میر جنڈانی اور حاجی کو معلوم تھا کہ اس دنیا میں جیب کی طاقت سے بڑی طاقت کوئی اور نہیں ہے۔ جب صبح پانچ بجے سے پہلے پہلے تفریح باز دن کی یہ ٹولی پھر جیل کے اندر پہنچ گئی۔ تب جا کے کالی چرن کو اطمینان ہوا۔ بال بال بچے ورنہ آج نوکری ختم تھی۔

چودھواں باب

اگر کالی چرن کا بس چلتا تو اس واقعے کے بعد لاچی کو جیل کے اندر رہی کڑی سے کڑی سزا دیتا۔ کیوں کہ لاچی کی ہٹ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔ اگر عین موقعے پر پولیس انسپکٹر اپنے افسر بھائی کی مدد کرنے پر راضی نہ ہو جاتا تو دوسرے ہی روز شور مچانے والے اخبار اور بات کا بتنگڑ بنانے والے اخبار نویس یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوتے کہ آج جیل کے قیدی پولیس کی حوالات میں کیسے پلائے گئے۔ اسے لاچی پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ کمینی خانہ بدوش دو ٹکے کی چھوکری جلانے اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے اس کا جی چاہتا تھا کہ ٹکٹکی پر بندھوا کر لاچی کی پیٹھ پر بید لگائے۔ اور عالم خیال میں اس نے ایسا ہی کر لیا۔ اور وقتی طور پر اس کی مسرت سے اس نے لطف بھی اٹھایا۔ مگر جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔ حقیقت یہی تھی کہ لاچی کی تصویر خوب چھپ رہا تھا۔ اس لئے لاچی کی رسائی سپرنٹنڈنٹ جیل تک تھی اور یہ بات بالکل صاف تھی کہ بید زنی تو کجا وہ ذرا سی بدسلوکی پر سپرنٹنڈنٹ جیل سے سارا واقعہ کھول کر بیان کر دے گی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہی سوچ کر کالی چرن چپ رہا۔ اور اس نے لاچی سے کسی طرح کی بازپرس نہیں کی۔ جیناں بائی نے لاچی کو ضرور دھمکا دیا کہ وہ واقعہ کا خوب چرچا یا کسی سے کل ذکر کرے۔ ورنہ مجھے سخت سزا دی جائے گی۔ بڈھی جیناں بائی کی خاطر لاچی نے خاموش رہنا منظور کر لیا۔ البتہ اس واقعے کے بعد دل آرا اور لاچی کی کٹی ہو گئی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے

سے بولنے کے لئے تیار نہ تھیں ۔ اس میں کسی ذاتی دشمنی کو دخل نہ تھا ۔ ان دونوں عورتوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ تھا ۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کسی طرح کا حسد بھی نہ تھا ۔ یہ لڑائی خیالات کی لڑائی تھی ۔ دل آرا کا خیال تھا کہ لاچی ضرورت سے زیادہ اپنی عصمت کی اہمیت جتاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس کا تعلق عورت کی روح اور اس کی پوری شخصیت سے ہے ۔ یہ غلط ہے ۔ یہ عورت کی عصمت تو عورت کے ہاتھ میں ایک طرح کا ہتھیار ہے جو اسے اپنی زندگی اور آسائش کے لئے مناسب موقعوں پر مناسب طریقے سے استعمال کرنا چاہئے اور اس میں کسی قسم کی جذباتیت کا دخل نہیں ہونا چاہئے ۔ جانے لاچی کے دل میں کیا خیال تھے وہ پڑھی لکھی تو تھی نہیں کہ دل آرا کی طرح اپنے دل کی بات انداز بیان کے پردوں میں چھپا کر بیان کر سکتی ۔ بس اسے ایک ضد تھی ۔ ایک جنون تھا جو اس کے سر پر سوار تھا ۔ وہ تو صرف یہ کہتی تھی ۔

میں نہیں بکوں گی ۔ کسی قیمت پر نہیں بکوں گی ۔

اور سے یہ جو دل آرا ہے ۔ جو دیکھنے میں اتنی خوب صورت دکھائی دیتی ہے ۔ بڑی آوارہ اور بد قماش عورت ہے ۔ میں اسے کبھی منہ نہ لگاؤں گی ۔ اگر آپ اسے کسی عقیدے کا نام دے سکتے ہیں تو یہی لاچی کا عقیدہ تھا ۔ مگر اس دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے ۔ کیوں کہ یہ ایک بھلی ہوئی معقولیت پسند دُنیا ہے جس میں آپ اور ہم رہتے ہیں ۔ اس دُنیا میں جب کوئی لاچی جیسی گمراہ روح آ جاتی ہے تو ہم میں سے ہر ایک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے راہ راست پر لایا جائے ۔ اپنے بھلے کے لئے نہیں ۔ صرف اس کی اپنی بھلائی کے لئے ۔ اس قسم کے غلط احمقانہ غیر متوازن عقیدے کو اپنے دل میں جگہ دے کر کوئی عورت ایک دن بھی اس دُنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی ۔

یہی سوچ کر جیناں بائی اور جیل کی دوسری عورتوں نے لاچی کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ۔ اور مسلسل ڈیڑھ دو سال تک وہ اپنی کوششوں میں لگی رہیں ۔ حاجی عبدالسلام اور میر چنڈائی نے بھی اس کار خیر میں روپے پیسے سے ان کی مدد کی ۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حاجی عبدالسلام اور میر چنڈائی دونوں نے اس رات کے خوفناک واقعے کے بعد یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جس طرح ہو سکے لاچی کا

غرور توڑ دینا چاہیئے اور اس کی شخصیت کو اور اس کے ذاتی حسن و جمال کے وقار کو کچل کر ایسا ہموار کر دینا چاہیئے جیسے کولتار کی سڑک ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے حاجی اور میر چندانی نے چینائی کو ٹھیکہ دیا۔ کیوں کہ مہذب و متمدن دنیا میں آج کل ہر کام ٹھیکے پر دیا جاتا ہے۔ دونوں بینکروں نے اس کام کے لئے پچاس ہزار روپیہ منظور کیا۔ وہ لوگ جو دل آزار کے لئے پندرہ بیس ہزار روپیہ خرچ کرنا اپنی تاجرانہ جبلت و ذہنیت کے خلاف سمجھتے تھے اب تاؤ کھا کر پچاس ہزار تک دینے کو تیار ہو گئے ان لوگوں کا غصہ بھی روپے کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ لوگ اگر دھرم اور ایمان پر آجائیں تو مندر اور مسجد بنانے کے لئے ہزاروں خرچ کر دیں۔ انتقام پر آجائیں تو ہزاروں خرچ کر کے مجھے اور آپ کو مروا ڈالیں۔ محبت کرنے پر آجائیں تو اپنی محبوبہ کو اشرفیوں میں تول دیں۔ اور سونے سے لاد دیں۔ ایک غریب آدمی اُن کے مقابلے میں محبت کرنے کی جرأت کہاں کر سکتا ہے۔ اور پھر لاچی ایسی ہے یا۔ وہ مدد گار عورت کب تک سونے کی سڑک پر چلنے سے انکار کرے گی۔ یہ بھی دیکھنا ہے۔

اس لئے بہت سوچ سمجھ کر یہ پراجیکٹ منظور کیا گیا۔ "لاچی پراجیکٹ" اس کا تخمینہ پاس ہوا۔ ٹھیکہ دے دیا گیا۔ اور مزدور کام پر لگا دیئے گئے۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات!

میں نہیں بکوں گی۔ مر جاؤں گی مگر نہیں بکوں گی۔

یہی لاچی کا آخری فیصلہ تھا۔

بیناں نے سمجھایا:۔

پچاس ہزار کی رقم کوئی کم نہیں ہوتی آج کل کے زمانے میں۔ احمق نہ ہو۔ آخر قبول کر لو۔ اپنی زندگی بنا لو۔

اور گل سے دھوکہ کروں۔

گل کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

کیا دھوکا اسی کو کہتے ہیں جس کا پتہ نہ چلے۔ اور تمہارا کیا خیال ہے؟

مجھے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ میں نے کس سے دھوکہ کیا ہے۔

اس میں دھوکے کی بات کیا ہے۔ یہ تو ایک وقتی بات ہو گئی۔ سزا اس جیل کی چہار دیواری تک محدود رہے گی۔ جب تم اپنی سزا بھگت کے جیل سے باہر نکلو گی تو اس پچاس ہزار کے سہارے ایک نئی زندگی شروع کر سکو گی۔

گل سے کیا کہوں گی۔ یہ روپیہ میں نے کہاں سے حاصل کیا ہے۔

چاہو تو کہہ دینا کہ میرے نام لاٹری نکلی ہے۔ چاہو تو سچ سچ بتا دینا۔ پھر دیکھ لینا۔ گل کی آنکھیں تمہارے بے غرض محبوب کی آنکھیں بھی ان روپیوں کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ اور وہ تمہاری زبان سے تمہاری بے وفائی کی داستان سن کر بھی تم سے سمجھوتہ کرے گا۔

نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا۔

شرط ہو جائے۔

نہیں میں شرط لگانے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں۔ یہ بات نہیں ہے مجھے گل پر بھروسہ نہیں ہے۔ وہ تو ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ میرا گل...... وہ بھی میں جانتی ہوں۔ لیکن کیوں ایک شرط کی خاطر ایسی غلط بات کروں۔

اس میں غلط بات کیا ہے۔ تم اپنے جسم کی مالک ہو۔ یہ جسم تمہارا ہے کسی دوسرے کا تو ہے نہیں۔ اور محبت تو بے کار سا خیال ہے۔ آنی جانی بات ہے۔ زندگی میں دس بار محبت ہوتی ہے۔ بیس بار ٹوٹ جاتی ہے۔ چالیس بار پھر ہو جاتی ہے۔ خود میں نے اپنی جوانی میں جانے کتنی محبتیں کر ڈالیں۔ جب پہلی محبت ذرا پرانی اور بوسیدہ ہونے لگی میں اس محبت کا دروازہ بند کر کے نئی محبت کا دروازہ کھول دیا۔

واہ! لاچی بڑھے غصے سے بولی۔ عورت کی محبت نہ ہوئی میونسپلٹی کی ٹونٹی ہو گئی۔ جب جی چاہا ٹونٹی گھما کے پانی پی لیا۔ جب جی چاہا گھما کے بند کر دیا۔

جینا ان بائی لاجواب ہو کے چپ ہو گئی۔

پلٹ پلٹ کر طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے اس نے ہزار بار اس نے بات کو

مختلف پیرایوں سے لاچی کے سامنے پیش کیا۔ مگر لاچی کا ایک ہی جواب تھا۔ اس میں اس کی ضد کو دخل نہ تھا۔ لاچی کا جواب گویا اس کے جسم اور روح کی پوری شخصیت کا جواب تھا۔ وہ کوئی دوسرا جواب دے نہ سکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ عقلی اعتبار سے لاجواب ہو جاتی۔ قائل بھی ہو جاتی۔ مگر دوسرے لمحے میں غم و غصے۔ احتجاج اور نفرت کا ایک ریلا سا لاوے کی طرح اُبلتا ہوا اس کے رگ و ریشے میں سما جاتا اور وہ غصے سے پاؤں پٹک کر کہتی۔

نہیں نہیں جو میری مرضی کے خلاف چھوئے گا۔ میں اسے کچا چبا جاؤں گی۔

کچا تو خیر وہ کیا چباتی۔ جیل میں ایک سے ایک بڑا گھاگ رہتا تھا۔ جو لاچی کی گردن پر چھری رکھ کر اس کا غرور توڑ سکتا تھا۔ مگر کرم بخت خوب چند کی وجہ سے سب اس سے ڈرتے تھے۔ اس کے ہوتے ہوئے لاچی کو کسی بھی جال میں نہیں پھنسایا جا سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ جو ہو سکتا تھا وہ کیا جا رہا تھا۔

لاچی کو جیل میں عجیب عجیب تجربے ہو رہے تھے۔ ایک روز اس کی ملاقات گنگا بائی سے ہوئی۔ جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔ کم بخت کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی اس پر دو درجن چوریوں کا الزام ہے۔

کیا تم مرغیاں چراتی تھیں۔ لاچی نے اس سے پوچھا۔

گنگا کے مُنھ سے ہنسی کا فوارہ اُبل کر بکھر گیا۔ اس کی چاندی جیسی ہنسی کی لہریں دور دور تک فضا میں پھیل گئیں۔

بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

نہیں میں کپڑے چراتی تھی۔

کیسے۔

میرے ساتھ دو مرد بھی کام کرتے تھے۔ ہم تینوں کی ایک ٹولی تھی۔ ہم لوگ آدھی رات کے وقت بڑی بڑی دکانوں کے شوکیس کے کانچ بڑی احتیاط سے توڑ ڈالتے تھے۔ پھر اُن

میں گھس کر چوری کرتے ۔ وہ دونوں مرد باہر رہتے ۔ میں اندر جا کر پلاسٹک کے ماڈلوں کے جسم سے ساڑیاں اُتار لیتی اور دوسرے تھان بھی جو شوکیس میں سجے ہوتے نکال نکال کر باہر پھینکتی ۔

اگر کوئی پولیس والا آجاتا ۔ تو وہ دونوں مرد ادھر اُدھر بھاگ جاتے اور میں شوکیس میں کھڑی ہو کر بالکل ایک ماڈل کی طرح بن جاتی اور پولیس والے بھی ایک پلاسٹک کا ماڈل سمجھ کر آگے چلے جاتے تھے ۔

اب کے لاچی خوب ہنسی ۔
اُسے یہ ترکیب بہت پسند آئی ۔
بہت عمدہ ۔ بہت اچھی ترکیب ہے بہت کم کسی کو سوجھی ہوگی ۔
ہاں مگر پولیس والوں نے آخر ہمیں بھی پکڑ ہی لیا ۔
تم جیل سے باہر جا کر کیا کرو گی ۔
پھر وہی کام شروع کروں گی ۔
پھر سزا پانے کا فائدہ کیا ہوا ۔
سزا مجرم کے لئے ایک وقفہ ہے ۔ گنگا نے سوچتے ہوئے کہا ۔
پھر بولی ۔ اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے ۔
تم نے شادی نہیں کی ۔ لاچی نے پوچھا ۔
جن دو مردوں کے ساتھ میں کام کرتی ہوں ان دونوں کے ساتھ میں نے تقریباً شادی کر رکھی ہے ۔
دونوں کے ساتھ ۔ لاچی حیرت سے بولی ۔
ہاں دونوں کے ساتھ گنگا نے کسی قدر افسردگی کے ساتھ کہا ۔
تھوڑی دیر وہ سوچتی رہی ۔ پھر بولی ۔ اور اب اس کا چہرہ پھر بشاش ہو گیا ۔ مگر وہ دونوں مجھے بہت خوش رکھتے ہیں ۔

لاچی کے دل میں ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ جیل سے نکل کر کچھ عرصے کے لئے اس پیشے کو اختیار کرے ۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں اس طرح کی چوری کی خواہش بھی پیدا ہوئی۔ اس طرح کا خطرہ مول لینا اسے بہت پسند آیا مگر دو مردوں والی بات اسے پسند نہ آئی۔ آخر اب وہ مردوں کے ساتھ برابر ان کے خطرے کی حصہ دار ہوتی ہے برابر کام کرتی ہے تو اس پہ یہ توقع کیوں کی جاتی ہے کہ چوری کے علاوہ وہ اپنا سب کچھ ان کے حوالے کر دے۔ یہ تو دھاندلی ہے ۔ برابر کی سلیچے واری نہیں ہے ۔

لاچی کو شلیا بھی بہت عجیب معلوم ہوئی۔ کوشلیا کے لئے نام تھے ۔ اقبال بانو۔ میری ڈی سوزا۔ سرجیت کور اور جانے کیا اَلا بَلا۔ وہ گریجویٹ لڑکی تھی۔ انگریزی کے علاوہ اُردو۔ ہندی پنجابی مراٹھی ۔ بنگالی ۔ فرینچ ۔ تامل اور ملیالم زبانوں میں شُدبُد رکھتی تھی ۔ بڑی اَپ ٹو ڈیٹ اور فیشن ایبل لڑکی تھی۔ گرفتار ہونے سے پہلے اس کا دھندا یہ تھا کہ وہ بیکار نوجوانوں کو نوکری کا لالچ دے کر اور مختلف منسٹروں اور افسروں سے اپنا رسوخ ظاہر کر کے ان سے روپیہ اینٹھتی تھی اور روپیہ لے کر رفو چکر ہو جاتی تھی ۔ آج تک وہ دو تین سو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دھوکا دے کر اس طرح ان سے ہزاروں روپیہ حاصل کر چکی تھی ۔

لاچی نے پوچھا ۔ مگر تم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ کہیں بھی ملازمت کر کے دو تین سو روپے باعزت طریقے سے کما سکتی ہو۔ دو تین سو روپے میں میرا خرچ پورا نہیں ہوتا ۔

تو خرچ کم کر دو ۔

خرچ کم نہیں ہو سکتا ۔ میں اچھی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں ۔

اچھی زندگی کیا ہوتی ہے ۔

اچھی زندگی اچھے زیوروں اور بہت سے روپے سے حاصل ہو سکتی ہے ۔

روپیہ ! روپیہ !! روپیہ کیا دُنیا میں خوشی صرف روپے سے حاصل کی جا سکتی ہے ۔

خوشی تو اس دُنیا میں عورت کو کہاں ملتی ہے ۔

کوشلیا غصے سے بولی۔ میرے ماں باپ نے دولت کے لالچ میں آ کر مجھے ایک بڈھے کے گلے باندھ دیا۔ جب وہ بڈھا مر گیا تو اس کی پہلی بیوی اور بچوں نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا۔ جب اپنوں نے مجھ سے دھوکا کیا تو میں غیروں سے دھوکا کر کے کون سا اتنا بڑا پاپ کر رہی ہوں۔ میں نے لاکھ چاہا کہ کوئی شریف آدمی مجھ سے شادی کرے۔ تا کہ میں مذہبی اور قانونی اعتبار سے خود کو اس کے ہاتھ بیچ کر آرام وسکون کی زندگی گزاروں۔ مگر کوئی شریف آدمی مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

۔ تو گویا تم شادی میں بھی بیچنے کی بات کرتی ہو۔

شادی میں بھی عورت ایک طرح اپنا جسم بیچتی ہے اور کیا کرتی ہے۔

محبت کوئی چیز نہیں۔

ہوتی ہوگی۔ کوشلیا بڑی تلخی سے بولی۔ مجھے تو نہیں ملی۔

لاچی نے سوچ سوچ کر کہا۔ میں تو سمجھتی ہوں تم اتنی اچھی ہو کہ ہر شریف آدمی تم سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ اگر تم اسے اپنی فریب کاری کی باتیں نہ بتاؤ۔

میں جس شریف آدمی سے شادی کا خیال کروں اسے کیسے نہ بتاؤں۔ اسے تو سب کچھ بتانا ہی پڑے گا میں ہر بار جیل سے چھوٹ کر تہیہ کرتی ہوں کہ اب سیدھے راستے چل کر کسی شریف آدمی سے شادی کر لوں گی۔ اور جب کسی شریف آدمی کو اپنی کہانی سناتی ہوں تو وہ بدک جاتا ہے۔

شریف آدمی سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ لاچی نے حیرت سے پوچھا۔

ایسا آدمی جس کی آمدنی کم از کم ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہو۔

ارے۔ بے اختیار لاچی کے منھ سے نکلا۔ تب تو واقعی کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔

کوشلیا عرف اقبال بانو عرف سرجیت کور نے اپنے بریدہ گیسوؤں کو ایک ادائے خاص سے جھٹکا دیا جیسے اسے دنیا میں کسی کی پروا نہیں۔ پھر اس نے مردوں کو ایک موٹی سی غلیظ گالی دی اور لاچی سے منھ موڑ کر اپنی بارک کی طرف چل دی۔

اس دن لاجی کے خیالات میں عجیب اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ جب وہ اپنا گاگرا پہنے ہاتھ پر دت اُٹھائے خوب چند کے سامنے اسٹول پر کھڑی ہوگئی تو آج اس کے چہرے پر دو روز کی سی بشاشت نہیں تھی۔ آج اس کا چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ خوب چند تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ یکایک لاجی بولی۔ ٹیسرن ٹان۔

ہاں لاجی۔

اگر روپے سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو ایک روپے سے بھی ہو سکتی ہے اور ایک ہزار سے بھی۔

ہاں لاجی۔

لاجی تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر بولی۔ سیسری ٹان۔

ہاں لاجی۔

کیا تم شریف آدمی ہو۔

کیا مطلب۔

یعنی تمہاری تنخواہ کتنی ہے۔

چھ سو روپے ہے۔

تب تم شریف آدمی نہیں ہو۔

خوب چند کا قلم رک گیا۔ وہ لاجی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ایسا کیوں سوچتی ہو تم۔ میں نے تم سے کبھی کوئی گستاخی کی۔

نہیں۔ مگر کوشلیا کہتی ہے کہ شریف آدمی وہ ہوتا ہے جس کی تنخواہ کم از کم ایک ہزار روپیہ ہو۔

خوب چند ہنسا بولا۔

جو بات کوشلیا کہتی ہے وہی بات دُنیا بھی کہتی ہے۔ اور اس لئے اس دُنیا میں فریب کاری ہوتی ہے۔

لاچی سوچ سوچ کر پھر بولی۔

سُپر کی شان۔

ہاں لاچی۔

تو کیا جو آدمی ایک ہزار کماتا ہے وہ دھوکہ نہیں کرتا۔

نہیں کرتا تو ہے۔ بلکہ ایک ہزار پانے والا اور زیادہ دھوکہ کرتا ہے۔

پھر شرافت کیا ہوتی ہے۔

تم نے بہت مشکل سوال پوچھا ہے لاچی۔ خوب چند نے لاچی کے قریب جا کر کہا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک خط نکال کر کہا۔

تمھارے سوال کا جواب اس خط میں ہے۔

یہ خط گل کا ہے۔ لاچی زور سے چلائی۔

ہاں۔

لاچی چھلانگ مار کر اسٹول سے نیچے آگئی۔ وہ خط لینے کے لئے بچوں کی طرح بے قرار ہو کر خوب چند کے پاس دوڑی۔ خوب چند بچوں کی طرح اس سے دور بھاگنے لگا۔ آخر لاچی نے اسے پکڑ لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر اس سے خط چھین لیا۔ پھر اس نے خوب چند کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اسٹول پہ بٹھا دیا۔ جس پر وہ بیٹھی تھی۔ اور وہ خود ایزل کے پاس جا کھڑی ہوگئی۔ اور برش اٹھا کر اس نے تہدیدی انداز سے اسے جھلاتے ہوئے کہا۔

ابھی گل کا خط مجھے سناؤ۔ ورنہ میں اس برش سے تمھارے سارے رنگوں پر پانی پھیر دوں گی۔

ارے رے۔ ایسا مت کرنا۔ میں تمھیں ابھی خط سناتا ہوں۔

خوب چند نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اور خط سنانے لگا۔ لاچی دوڑ کر اس کے قدموں میں آکر بیٹھ گئی۔ اس نے تھوڑی خوب چند کے گھٹنے پر رکھ لی اور خط سننے لگی۔

خوب چند بولا۔

جان سے پیاری لاچی۔

لاچی نے خوب چند کو مارنے کے لئے ایک دم ہاتھ اُٹھایا۔

خوب چند نے اس کا وار روکتے ہوئے کہا۔

ارے پگلی! یہ میں تھوڑی کہہ رہا ہوں۔ یہ تو گل کا خط تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہوں۔

اچھا تو ٹھیک ہے۔ مگر دیکھو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سنانا۔ اپنی طرف سے کچھ جوڑنا نہیں۔

ورنہ.....

خوب چند سنانے لگا۔

میرے دل میں ہر دم تمہارا تصور رہتا ہے۔ ہر وقت تمہاری تصویر میری آنکھوں میں سمائی رہتی ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اپنی لاچی کی پیاری پیاری صورت مجھے یاد نہ آتی ہو۔ اوّل سے آخر تک۔ زندگی سے موت تک جب تک زندہ ہوں اپنی لاچی سے محبت کرتا رہونگا۔

لاچی آنکھیں بند کر کے سنتی گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ معمولی لفظ نہیں ہیں شہد کے گھونٹ جو اس کی روح میں اُترتے جا رہے ہیں۔ نرم۔ ملائم۔ ریشم کے شہپر پر ہیں جن کے سہارے وہ کائنات کے خلاؤں میں اڑی جا رہی ہے۔

گل..... گل..... گُل..... میرے پھول.....

پندرہواں باب

دوسرے ماہ گل لاچی سے ملنے کے لئے آیا۔

لاچی گل کا ہاتھ پکڑ کر خوب چند کے پرائیویٹ کمرے میں لے گئی۔ اور بڑے فخر سے اُسے خوب چند کو دکھا کے بولی۔

یہ میرا گل ہے۔

خوب چند نے گل کو سر سے پاؤں تک یعنی چپل سے پشاوری کلاہ تک دیکھا۔ لانبا بانکا ۔ دبیبہ ۔ چھریرا گل ۔ مردانہ وقار اور حسن کی زندہ تصویر۔ خوب چند نے ایک لمحہ کے لئے دل ہی دل میں اپنا اس سے مقابلہ کیا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک پھیکی کھسیانی سی روتی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اس نے گل سے کہا۔ آؤ آؤ ۔ یہاں بیٹھو۔

لاچی بولی ۔ اور یہ میرا سیٹھ خان ہے .....

بہت اچھا آدمی ہے ۔ اس کی مہربانی سے ہم لوگ یہاں مل رہے ہیں۔ ورنہ لوہے کی جالی والے کمرے میں ملتے۔

گل نے تشکر آمیز نگاہوں سے خوب چند کی طرف دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے ہاتھوں کی بے چینی البتہ رہی تھی کہ گل بے حد مضطرب ہے۔

خوب چند نے جب گل کی خاموشی دیکھی اور اس کی انگلیوں کا اضطراب تو اس نے پرسش

کو آہستہ سے پانی کے چھوٹے سے پیالے میں دھیرے دھیرے دھویا۔ پھر آنکھیں جھکائے آہستہ سے کمرے سے باہر ہوگیا۔

خوب چند کے جانے کے بعد لاچی بے اختیار ہو کر گل سے لپٹ گئی۔ اس نے اس کا وہ پشاوری کلاہ جس پر لنگی بندھی ہوئی تھی اتار کر الگ رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کو پہلے اپنے ہاتھوں میں لے کر پھر اسے اپنے گالوں سے لگا کر گلو گیر آواز میں بولی۔

گل۔ گل تم پچھلے ماہ مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آئے۔ کیوں

گل چپ رہا۔ وہ اپنے بے چین ہاتھوں کو کبھی کھولتا کبھی بند کرتا۔ اس کے سینے سے لگی لاچی اس کے دل کی دھڑکن سن رہی تھی۔ جھولے ہوئے گل کا ہاتھ لاچی کی کمر پر گیا اس نے اک دم اسے بھینچ کر اپنے گلے سے لگا لیا پھر ایک دم چھوڑ دیا۔ اور سر جھکا کر لاچی سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔

گل کیا بات ہے۔ لاچی اک دم گل کے قریب آگئی۔ اور گل کا منھ اپنی طرف پھیرتے ہوئے بولی۔ کیا بات ہے۔ بتاؤ گے نہیں۔

گل نے آہستہ سے کہا۔ میری درخواست نامنظور ہوگئی ہے۔

کون سی درخواست۔

ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست۔

لاچی یکایک کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

نامنظور ہوگئی تو کیا ہوا۔ اس میں اتنا منھ لٹکا کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خانہ بدوشوں کو دیکھو۔ ہم تو کہیں کے شہری نہیں ہوتے۔ جہاں جی چاہتا ہے چلے جاتے ہیں۔

تمہاری بات اور ہے۔ میں پٹھان ہوں۔ پاکستان کے ملک کا رہنے والا ہوں۔

ملک کیا ہوتا ہے۔ لاچی نے پوچھا۔

ملک۔ گل بولتے بولتے رک گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے بھی اپنے آپ سے پوچھا .... واقعی ملک کیا ہوتا ہے اور جب اسے اس کا کوئی معقول جواب نہ سوجھا تو اس نے

رُکتے رُکتے کہا۔ مُلک تو مُلک ہوتا ہے۔ جیسے ایک مُلک پاکستان ہے ایک مُلک ہندوستان ہے ایک مُلک چین ہے۔ ایک مُلک جاپان ہے۔ یہ سب مُلک ساری دھرتی کے الگ الگ حصّے ہیں۔

مگر ہم خانہ بدوشوں کے لئے تو یہ ساری دھرتی ایک ہے۔

مگر اس دُنیا کے انسانوں کے لئے ایک نہیں ہے۔ گُل نے ذرا تلخی سے کہا۔ انھوں نے جو اپنے آپ کو انسان۔ مہذب اور ترقی یافتہ کہتے ہیں اس دھرتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اور مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہ تیرا، وہ میرا۔ وہ اس کا۔

لیکن تم میرے ہو۔ لاچی نے اپنے دونوں بازوؤں سے گُل کے گرد بڑی محبت سے گھیرا ڈالتے ہوئے کہا۔ تم صرف میرے ہو۔ مجھے کسی کے مُلک سے کیا لینا دینا ہے۔ میں تو ایک غریب خانہ بدوش لڑکی ہوں۔ مجھے ان بڑی بڑی باتوں کی کچھ نہیں ہے۔ اگر تمھاری درخواست انھوں نے نامنظور کر دی ہے تو کیا ہوا۔ اللہ میاں نے ہم دونوں کی محبت کی درخواست تو نامنظور نہیں کی۔

اب تمھیں کیسے بتاؤں لاچی۔ گُل نے حد مضطرب ہو کر کہا۔ اس درخواست کے نامنظور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں ہندوستان میں نہیں رہ سکوں گا۔ تُم سے ہر ماہ ملنے کے لئے نہیں آیا کروں گا۔ جب تم قید و بند کی سختیاں جھیل کر اس جیل خانے سے باہر نکلو گی تو میری صورت نہ دیکھ سکو گی۔

نہیں نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔ تُم مجھے پریشان کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔ کہہ دو نا گل یہ سب کچھ مذاق ہے۔

گُل سر جھکائے چُپ چاپ بیٹھا رہا۔ بہت دیر کے بعد جب اس نے سر اٹھایا تو لاچی نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

ہم لوگ سود خور پٹھان تھے۔ برسوں سے اس مُلک میں یہی دھندا کرتے تھے جب کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میرے باپ نے کبھی ہندوستان کا شہری بننے کے لئے نہیں سوچا۔ نہ میں نے۔ ہم لوگ سال دو سال بعد اپنے وطن جاتے تھے۔ اور وہاں چند ماہ رہ کر پھر واپس آجاتے

سے تھے ۔ ہمارا روزگار یہاں تھا۔ وطن دوسرا تھا۔ مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے ۔ پہلے یہ ایک ملک تھا۔ اب اس کے دو ملک ہو گئے ہیں۔ اب پاکستان ایک الگ اور آزاد ملک ہے ہندوستان دوسرا ملک ہے ۔ الگ اور اپنی جگہ آزاد۔ قانون بھی بدل گئے ہیں۔ سود خوری پر پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔ میرے باپ کا دھندا مندے میں چلا گیا ہے وہ تو پاکستان جا رہا ہے ۔ اس نے تو کبھی ہندوستان کا شہری بننے کے لئے نہیں سوچا ۔ میں نے بھی اس سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر پہلے تم نہ تھیں اس لئے میں کیوں ایسا سوچتا اب میرے دل میں تمہاری محبت آئی تو میں نے یہاں رہنے کا سوچا۔ میں نے ہندوستان کا شہری بننے کی درخواست دی ۔ مگر یوں سوچا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ان لوگوں نے میری درخواست نامنظور کر دی ۔ اب وہ مجھے یہاں رہنے نہ دیں گے ۔

تم نے ان سے کہا ہوتا۔ میری لاچی یہاں ہے میں یہاں سے کیسے جا سکتا ہوں ۔

وہ لوگ محبت کو نہیں سمجھتے۔ وہ صرف نفرت کو سمجھتے ہیں ۔

تم نے کہا ہوتا۔ یہ ساری دھرتی خدا کی ہے ۔

یوں تو اس دُنیا میں مندر مسجد اور گرجا بہت سے ہیں۔ مگر سچ پوچھو تو زمین کا ایک چپہ خدا کا نہیں ہے ۔

میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ۔ لاچی یکایک بڑی تیز لہجے سے بولی ۔ مگر اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا ۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے بازوؤں سے ہٹا لیے ۔ اور اپنے چہرے کو ان میں چھپا لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی ۔

کیوں روتی ہے لاچی جانے کب سے آج سے نہیں شاید سینکڑوں۔ ہزاروں سال سے۔ روزِ ازل سے ۔ تخلیقِ آدم سے انسانیت اسی طرح رو رہی ہے اور محبت اس طرح بین کر رہی ہے۔ نام تو بہت لیتے ہیں لوگ انسانیت کا محبت کا اور خوب صورتی کا اور بھائی چارے کا۔ حُسن کا اور پاکیزگی کا سیاست دانوں نے ان قدروں کے ڈھنڈ والے پیٹ پیٹ کر ادیبوں نے کتابیں لکھ لکھ کر فلاسفروں نے زندگیاں اسی سوچ میں گھلا کر انسانیت کو سہارا دیا ہے۔ کس نے پاکیزگی کی

عزت کی ہے۔ کس نے حُسن کو شائستگی بخشی ہے۔ یہ لوگ محبت کی آڑ میں نفرت انسانیت کے رُوپ میں درندگی۔ خوب صورتی کے پردے میں بدصورتی اور پاکیزگی کے جھروکے میں گندگی پھیلا پھیلا کر اپنی بلند و بالا تہذیب کا جھنڈا اونچا کرتے ہیں۔ تہذیب ان انسانوں سے زیادہ دریائی گھوڑوں میں پائی جاتی ہے۔

گُل نے آہستہ سے کہا۔ سات دن کے اندر اندر مجھے یہاں سے چلا جانا ہوگا۔

لاچی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گُل نے لاچی کے آنسو پونچھے۔ اس نے صرف اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے جھٹک دیئے۔ اس کا نچلا جبڑا تن گیا۔ اس نے بڑی سختی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کیں اور کھڑا ہوگیا۔

لاچی نے اس کے بازو پکڑ لئے۔ مت جاؤ میرے گُل۔ مت جاؤ۔ کہیں مت جاؤ۔

گُل نے بڑی مشکل سے ایک قدم اٹھایا۔ اور دوسرا قدم تیسرا قدم لاچی اس کے پاؤں کے ساتھ روتی اور گھسٹتی چلی آئی۔

مت جاؤ میرے گُل۔ مت جاؤ۔ لاچی رو رو کر بولی۔

آخری کوشش کر کے گُل نے لاچی کی گرفت سے اپنا پاؤں آزاد کر لیا اور دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لاچی وہیں زمین پر پڑی روتی رہی۔

بہت دیر کے بعد خوب چند اندر آیا۔ اور اس نے لاچی کو زمین سے اُٹھایا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ اور اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ اور پوچھا۔ گُل چلا گیا۔

ہاں۔ لاچی رندھے ہوئے گلے سے بولی۔ اور اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔ خوب چند اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

گُل نے مجھ سے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ مگر اس میں اس بے چارے کا کیا قصور ہے۔ قصور تو حالات کا ہے اور اس زمانے کا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو لاچی۔ گُل چلا گیا تو کیا ہوا میں تو

موجود ہوں ۔ میں تمھاری دیکھ بھال کروں گا۔ تمھیں جیل میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ اور جب تم جیل کاٹ کر آزاد ہو جاؤ گی تو میں اس جیل کی نوکری سے استعفیٰ دے دوں گا اور تم سے شادی کر لوں گا۔ اور تمھیں پیرس لے چلوں گا ۔ اور دُنیا کو وہ شاہکار دکھا دوں گا جو میری تصویر ہو گی ۔ اور دُنیا کو وہ شاہکار بھی دکھا دوں گا جس کے حُسن سے متاثر ہو کر میں نے اس کی تخلیق کی ہے۔

یکا یک لاچی نے اپنا جھکا ہوا سر خوب چند کے کندھے سے اُٹھا لیا۔ اس کا ڈھیلا بدن ایک کمان کی طرح تن گیا۔ وہ خوب چند سے الگ ہو کے بیٹھ گئی ۔ اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور شعلہ بار نگاہوں سے خوب چند کی طرف دیکھ کر بولی۔

شہری تمان ۔

ہاں لاچی ۔

کیا تم مجھے کسی طرح عمر بھر کی قید نہیں دے سکتے ۔

نہیں لاچی جس کا جتنا جرم ہوتا ہے اسے اتنی ہی سزا ملتی ہے ۔

تو پھر مجھے کس طرح عمر قید ہو سکتی ہے۔

اگر تم دوسری بار کسی انسان کو قتل کرو .... تو میں پھر جیل سے چھوٹ کر قتل کروں گی ۔ پھر قتل کروں گی اور اس وقت تک انسانوں کو قتل کرتی رہوں گی جب تک تم مجھے عمر قید کی سزا نہ دو ۔ یا پھانسی پر نہ چڑھا دو۔

تم ایسا کیوں سوچتی ہو لاچی ۔

اس لیے کہ تم سب قتل کر دینے کے لائق ہو ۔

پھر وہ وہاں سے اُٹھی اور ایزل پر رکھی ہوئی اپنی نامکمل تصویر کی طرف بڑھی ہاتھ بڑھا کر اس نے تصویر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر دونوں ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

تم عورت کی تصویر بنانے کا کیا حق رکھتے ہو ۔ کبھی تم نے اس کے دل کے اندر جھانک کر دیکھا ہے ۔ تم سب لوگ اس کے اردگرد دوسرے کی سلاخیں کھڑی کرنا چاہتے ہو لیکن تم لاچی کو

نہیں جانتے ۔ میں ایک آزاد خانہ بدوش لڑکی ہوں۔ میرے لئے کوئی ملک نہیں ہے ۔ کوئی قوم نہیں ہے اور کوئی مذہب نہیں ہے میں ہر دیوار پھلانگ جاؤں گی اور ہر سلاخ توڑ دوں گی ۔ میں چوری کروں گی ۔ جیب کتروں گی۔ قتل کروں گی۔ ڈاکے ڈالوں گی لیکن کبھی کوئی شخص کے سوا میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا سکے گا۔

لاچی نے گویا عرش کی بلندیوں سے زمین پر بیٹھے ہوئے حقیر خوب چند کو دیکھا۔ اور پھر شاہانہ وقار سے قدم اٹھاتی ہوئی اس طرح دھیرے دھیرے کمرے سے نکلی۔ جیسے اس نے انجیل کی آخری آیت آسمان سے زمین پر اتار دی ہو۔ اور اپنا کام ختم کر کے تختہ دار کی طرف بڑھ رہی ہو۔

اور خوب چند نے سوچا۔

لاچی! کیا کاغذی تصویر پھاڑ دینے سے ذہن کی تصویر بھی پھاڑی جا سکتی ہے ۔ بیوقوف دلربا! تیری تصویر تو میں اب آنکھ بند کر کے بھی بنا سکتا ہوں مگر اس نے لاچی سے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے تصویر کے ٹکڑے ہوتے دیکھتا رہا۔

سولہواں باب

خوب چند نے پھر بڑی محنت اور کاوش سے لاچی کی تصویر بنائی۔ جب تصویر مکمل ہوگئی تو لاچی نے اسے دیکھ کر کہا۔

یہ جھوٹی تصویر ہے۔

کیا جھوٹی ہے۔ خوب چند نے لاچی سے پوچھا۔

میں اتنی خوب صورت نہیں ہوں جتنی یہ تصویر ہے لاچی نے تصویر کی طرف دیکھ کر اعتراف کیا۔

یہ لباس میرا ہے یہ صورت بھی میری ہے۔ رنگت اور قد اور شکل سب بالکل ویسی ہی ہے۔ جیسی میں ہوں۔ تاہم میری تصویر ہوتے ہوئے بھی میری نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے میرے ساتھ۔ لاچی نے تصویر کی طرف سے مڑ کر خوب چند سے پوچھا۔

خوب چند کا رنگ فق ہوگیا۔ آخر وہ لمحہ آپہنچا جس کا اس کو انتظار تھا۔ وہ کہے یا نہ کہے اس نے اس تصویر کے خدوخال ہولے ہولے ابھارتے ہوئے کئی بار سوچا تھا۔ کہہ ڈالے پھر سوچا تھا کیوں کہے۔ آخر خاموشی کی بھی تو ایک زبان ہوتی ہے اور نگاہ بھی گویا ہوتی ہے۔ اور کانپتی ہوئی انگلیوں کی پور پور سے یہ کیسا نغمہ پھوٹتا ہے کیا یہ کسی کو نہیں سنائی دیتا۔ میں نے تو تیری تصویر کے ذریعے تجھ سے بہت کچھ کہا ہے لاچی پھر تو ہنستی کیوں نہیں۔ کیا تو صرف اس میں اپنی شخصیت دیکھتی ہے۔ اپنی صورت کا عکس۔ اپنے حسن کے خدوخال۔ لیکن میری روح کا جال تجھ سے

کیوں پوشیدہ ہے۔ میرے ترسے ہوئے برش کے رنگ۔ انھوں نے تیری تصویر میں کتنی نادیدہ حسرتوں کے رنگ برنگے گلزار کھلا دیئے ہیں۔ اری تو کیسی لڑکی ہے۔ میرے دل کا لہو بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اب میں تجھ سے کیا کہوں۔

خوب چند خاموش نگاہوں سے لاچی کی تصویر کی طرف دیکھتا رہا اور نہ بولا اس نے لاچی کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ اس کے منھ سے ایک آہ تک نہ نکلی۔ اس کی آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا۔ بس وہ خاموشی سے مٹھیاں بھینچے سختی سے ہونٹ بند کئے تصویر کے سامنے چپ چاپ کھڑا رہا۔

لاچی اس کے پاس آ گئی۔ اس نے خوب چند کے کندھے پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور بہت مدھم اور میٹھی آواز میں بولی۔ اگر میں گل سے پیار نہ کرتی تو تیری ہو جاتی مصوری مان۔

خوب چند یکایک چونکا۔ پھر اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں تن گئیں۔ اس کا سارا جسم طوفان میں لرزنے والے پتے کی طرح کانپا اور کانپ کر ساکت ہو گیا۔ گویا پتہ ڈال سے گر گیا۔ اور ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا کہیں دور فضا میں کھو گیا۔ موت کی وادیوں میں ہمیشہ کے لئے کھو گیا۔

مگر گل تو چلا گیا ہے ہمیشہ کے لئے۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔

خوب چند نے لاچی کی طرف مڑے بغیر کہا۔ جیسے وہ لاچی سے نہیں تصویر سے پوچھ رہا ہو۔

وہ نہ آئے گا تو کیا ہوا میں تو اس کے پاس جا سکتی ہوں۔ میں تو خانہ بدوش ہوں مصوری مان میرے لئے تو کوئی مکان نہیں ہے کوئی دیس نہیں ہے۔ کوئی دیوار نہیں ہے اور کوئی جیل نہیں۔ میں ہر کہیں جا سکتی ہوں۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں تو خود اکیلی پیدل چل کے بھی گل کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ چاہے وہ یہاں سے ہزاروں میل دور کیوں نہ رہتا ہو۔

میں نے سوچا تھا۔ خوب چند نے کہا۔ اور پھر رک گیا۔

کیا سوچا تھا۔

سوچا تھا یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔ تمہیں لے کر پیرس چلا جاؤں گا اور وہاں ایک اسٹوڈیو کھول کر صرف تمھاری تصویریں بنایا کروں گا۔

صرف میری کیوں۔

کبھی کبھی ایک شخصیت ایک سمندر کے برابر ہو جاتی ہے۔

میں نہیں سمجھی: لاچی نے حیران ہو کر کہا۔

خوب چند اس کی طرف مڑا۔ بولا یہ تو نہیں ہے کہ تم نے کچھ سنا نہ ہو۔ اور کچھ کہا نہ ہو آخر میرے نہ کہنے پر جب تم نے اتنا کچھ سمجھ لیا تو اتنی سی بات بھی کیوں نہ سمجھ سکو گی۔ اگر خود ہی نہ سمجھو تو میرے کہنے سے کیسے سمجھ سکو گی۔

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ روح کی بات روح سمجھ لیتی ہے لیکن کوئی روح دوسری روح میں اتنی ڈوب نہیں سکتی ہے کہ اس کے غم کو اپنا غم بنا لے۔ ہائے کتنی بڑی تنہائی ہے۔

لاچی بولی۔ تم ہمیشہ یا تو کچھ ثابت کرتے رہتے ہو۔ یا تصویر بناتے ہو۔ اور میں صرف چاہتی ہوں سُپیری مان۔ کیا صرف چاہنا کافی نہیں ہے۔

خوب چند نے لاچی کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا تھا کہ لاچی کو اپنے بازوؤں میں لے لے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ رک گیا۔ اس نے اپنے بازو بڑی سختی سے اپنے سینے کے گرد لپیٹ لیے۔ بولا کبھی کبھی چاہنا تو کیا کسی کے لیے مر جانا بھی کافی ہوتا ہے۔

ہائے تم نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔ لاچی نے تعریفی نگاہوں سے خوب چند کی طرف دیکھ کر کہا۔

بس یہی بات میں تم کے لیے ہمیشہ سوچتی تھی۔ مگر بیان نہیں کر سکتی تھی۔

خوب چند خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ لاچی رُخ پھیر کر تصویر کو دیکھنے لگی۔ بولی تم اس تصویر کا کیا کرو گے۔

میں اسے اپنے ساتھ پیرس لے جاؤں گا۔

اور یکا یک خوب چند کو احساس ہوا جیسے اسے اس وقت کچھ کرنا چاہیے۔ یا تو لاچی سے جھگڑا کر کے اسے کمرے سے باہر بھیج دینا چاہیے۔ یا زبردستی اپنے گلے سے لگا لینا چاہیے

یا اپنے سر کے بالوں کو نوچ لینا چاہیئے۔ ورنہ یہ لحہ بہ لحہ بڑھتا ہوا اضطراب اسے پاگل بنا دے گا۔ خوب چند نے ایک چھوٹی سی الماری میں کنجی لگائی۔ وہ اس میں سے خوشبو کی دو تین چھوٹی چھوٹی بوتلیں نکالیں اور انہیں تصویر پر لگانے لگا۔ بالوں پر رات کی رانی گردن پہ جوہی۔ گالوں پہ گلاب!

کیا کر رہے ہو۔ لاچی نے حیرت سے پوچھا۔

تصویر کو خوشبو لگا رہا ہوں۔

لاچی نے کہا۔ بڑے عجیب آدمی ہو۔ خوشبو تو برس جاتے جاتے اُڑ جائے گی۔

مگر یاد تو باقی رہ جائے گی۔ خوب چند لاچی کی طرف مڑا اور بولا۔ لاچی کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔ کسی دوسری چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خوب صورتی یاد ہے۔ یاد نغمے ہیں نغمہ گونج ہیں۔ گونج فضا میں فضا لہروں میں اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے؟

لاچی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ بولی۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ مجھے اس وقت گل یاد آ رہا ہے!

گل! گل!! گل۔ یکایک خوب چند چیخا۔ یہ وقت گل۔ گٹ آؤٹ مگر یہ کی نان!

لاچی اُسے یوں بپھرتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

گٹ آؤٹ۔ خوب چند دونوں ہاتھ پھیلا کر چیخا۔

لاچی دوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ راستے میں اسے دو تین بچیاں اسی دوڑتے ہوئے خوب چند کے کمرے کی طرف آتے ہوئے ملے۔ ایک بچی اس نے پوچھا۔ کیا ہوا۔

لاچی بہت تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ کیا ہوتا۔ تم ہی بتاؤ۔ جب کوئی مرد کسی عورت کو چاہتا ہے اور وہ عورت اسے نہیں چاہتی تو کیا ہوتا ہے۔

دل آرا نے پوچھا۔ کیا ہوا۔

وہ مجھ کو پیرس لے جانا چاہتا ہے مگر ہر مرد صرف اپنی چاہت کو چاہتا ہے وہ نہیں دیکھتا کہ عورت کیا چاہتی ہے۔

ہائے پیرس!

کوشلیا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس کی آنکھیں اشتیاق سے چمکنے لگیں۔ اسے بولو مجھے پیرس لے چلے۔

دوسری عورتیں ہنسنے لگیں۔ لیکن لاچی کو ہنسی نہ آئی۔ وہ سر جھکا کر اپنے گوشۂ تنہائی میں چلی گئی۔

تین روز تک لاچی اپنے بارک سے باہر نہ نکلی۔ وہ تین روز سے بخار میں پھنکتی رہی۔ تین روز تک ڈاکٹر اسے آکے دیکھتا رہا اور دوا دیتا رہا۔ لیکن بے سود۔ لاچی کا بخار بڑھتا ہی گیا۔ پانچویں روز ڈاکٹر بہت سنجیدہ اور متفکر سا چہرہ بنائے ہوئے لاچی کے بارک سے باہر نکلا۔ وارڈرن اس کے پیچھے پیچھے آیا۔ باہر جینان بائی۔ کالی چرن اور خوب چند کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے ان لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

حالت خطرناک ہے اسے فوراً ہسپتال میں بھیجنا ہوگا۔

جیل کے ہسپتال میں خوب چند نے پوچھا۔

نہیں! ڈاکٹر بولا۔ اسے چھوت کی بیماریوں کے ہسپتال میں بھیجنا ہوگا۔

چھوت کی امراض کے ہسپتال میں کس لئے۔ خوب چند نے گھبرا کے پوچھا۔

اس کے چیچک نکل آئی ہے۔

ہسپتال کی دنیا ایک تاریک اور عجیب دنیا تھی۔ وہ ہذیانی دنوں اور بیہوش راتوں کی دنیا تھی لاوے کی طرح کھولتے ہوئے دماغ اور آگ کی طرح جلتے ہوئے اور پیپ کی طرح رستے ہوئے زخموں کی دنیا تھی۔ ارے کتنے بڑے گڑھے تھے اس میں جیسے وہ قدم قدم پر پیپ اور لہو لاوے اور کیچڑ میں دھنستی چلی جا رہی ہو۔ اور اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ چیخ چیخ کر گل کو پکارتی اور جب وہ چیختی تو اندھیرے میں کہیں کہیں بجلی کوندتی۔ کہیں کہیں سیاہ گرجتے ہوئے بادل پھٹتے ہوئے نظر آتے اور گرے آفاق کے سراسیمہ ہیولوں میں اسے کبھی گل کبھی کالی چرن کبھی خوب چند کی پرچھائیاں نظر آتیں۔ اور نظر آتے ہی اوجھل ہو جاتیں۔ آنکھوں کے پٹ کھول کھول کر اپنی نحافہ جُرش

ماں اور باپ کو آواز دیتی۔ روح کی پوری طاقت سے اپنے قبیلے کو پکارتی اور خدا کو پکارتی جو سات زمینوں اور سات آسمانوں سے پرے کسی غیر مرئی دنیا میں کھڑا اس پر ہنس رہا تھا۔ وہ غم اور غصے سے اپنے ہونٹ دانتوں تلے چابتی تو ادھ پکے اور پیپ بھرے لہو کی دھار دل سے اس کا منہ بھر جاتا اور وہ غوں غوں کرکے بے ہوش ہو جاتی۔ یوں بھی اسے ہوش کم آتا۔ یا تو مکمل بے ہوشی ہوتی تھی یا نیم بے ہوشی۔ چیچک اور بخار اس کے جسم کے خلیوں میں یوں چل رہے تھے جیسے تیز رفتار آندھی بادلوں کو لئے ہوئے گرد و غبار اڑاتی ہوئی۔ درختوں کو جھکاتی ہوئی چھپروں کو توڑتی ہوئی انسانی بستیاں اجاڑتی ہوئی چاروں طرف تباہی مچاتی ہوئی۔ اس کے خوب صورت جسم و جاں کو اپنے پاؤں تلے روندتی ہوئی گزر رہی ہو۔ کہ قعر فنا تھا جس میں وہ گرتی جا رہی تھی۔ ایک گرداب مسلسل تھا جس میں وہ غوطے کھا کر ایک حقیر بے بضاعت بے جان تنکے کی طرح گردش کر رہی تھی۔ آسمان سر پر ٹوٹ پڑا تھا زمین پاؤں کے نیچے سے پھٹ گئی تھی۔ لال اودی تاریکی روشنیاں پھلجھڑیاں۔ ستارے۔ تارے۔ رے۔ سے۔ ریت سیت۔ کیچڑ.... کائی۔ جھیل جھیل جھیل جھل جھل کرتی جونکیں۔ کلبلاتے ہوئے کیڑے اس کے جسم پر رینگ رہے تھے۔ بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔ دیکھو یہ میری آنکھوں میں ابل رہا ہے۔ یہ آگ میری ہڈیوں کو جلا رہی ہے یہ کانٹوں کی طرح تیز زبان رکھنے والے کیڑے میرے جسم میں گھسے جا رہے ہیں۔ جھاڑیاں۔ جنگل۔ تلوے۔ کانٹے۔ آبلے۔ ریت میں ریت ہی ریت کھیت۔ کھیت۔ جھیت۔ چرت چرخ میں ٹوٹی میں گری۔ میں ڈوبی۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔

جب ۲۷ دن کے ہذیانی بخار کے بعد طوفان تھما۔ آندھی رکی اور لاوا منجمد ہوا تو لاچی نے ایک گہری اور بسیط تاریکی میں آنکھیں کھولیں۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے اندھی ہو چکی تھی۔ اور اس کی خستہ اور بدنما ہڈیوں کے ڈھانچے پر منڈھی۔ مرجھائی ہوئی کھال پر استے بڑے بڑے تاریک گڑھے تھے جیسے کسی نے اس کے حسن کے نیچے بارود رکھ کے فلیتے سے اڑا دیا ہو۔

مزید تین ماہ کے بعد لاچی کو ہسپتال سے واپس جیل بھیجا گیا ایک بار پھر لاچی کی مانند

سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں ہوئی۔ اسے کمرے میں لایا گیا جہاں جیل میں آنے سے پہلے روز لائی گئی تھی۔ جیل کے بہت سے لوگوں کو لاچی کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ حاجی اور میر حیدرانی۔ کوشلیا اور بھیناں۔ کانی چرن اور دوسرے لوگ۔ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ لاچی کے حسن کے ساتھ چیچک نے کیا سلوک کیا ہے۔ انہیں ہسپتال سے وقتاً فوقتاً جو رپورٹیں ملتی رہتی تھیں ان پر انہیں کامل اعتبار نہ تھا۔ کیونکہ انھوں نے لاچی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جو تصویر اپنی نظر سے دل میں اتر جاتی ہے وہ اس وقت تک نہیں مٹتی جب تک انسان پھر اپنی آنکھوں سے تبدیلی کا مشاہدہ نہ کرے۔ سب اسے دیکھنا چاہتے تھے مگر خوب چند تھا جو اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس نے یہ انتظام ضرور کر لیا تھا کہ جب لاچی اس کے کمرے میں لائی جائے اس وقت وہ تنہا ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسری کو اپنے ردعمل سے آگاہ ہونے دے۔ جب خوب چند نے اشارہ کیا تو جو لوگ لاچی کو خوب چند کے کمرے میں لائے تھے اسے اکیلی چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

جب لاچی اندر آئی تو خوب چند کا ہاتھ بے اختیار اپنی آنکھوں پر چلا گیا جیسے وہ آنکھیں یہ منظر دیکھنا نہ چاہتی ہوں۔ لیکن وہ اس ملاقات کے دوران میں پورے وقت اپنی آنکھیں بند کئے نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے لاچی کو دیکھنا پڑا۔ اور پہلی ہی نگاہ میں لاچی کی بدصورتی ایک برچھی کی طرح اس کے دل میں اتر گئی۔ کہاں تھی وہ متاع بے بہا جسے لے کر وہ پیرس جا رہا تھا۔ وہ پھول کی طرح شگفتہ اور زندگی کی طرح شاداب حسن جس کی تصویر مہینوں کی محنت شاقہ کے بعد اس نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ کیا یہی وہ لاچی ہے جس نے اس کے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔ جس کے تخیل نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ جس کے پائے ناز پر سر رکھ دینے کے لئے وہ بے قرار ہو اٹھتا تھا یہ بد ہیئت بد نما جسم۔ یہ خوفناک چہرہ۔ پھٹے ہوئے ہونٹ مڑی تھوڑی چپٹی ہوئی ناک اور تاریک گڑھوں میں چمکتی بے نور سپید سپید آنکھیں۔ کیا یہ وہ لاچی ہے میرے خدا۔

میری جان۔ لاچی آہستہ سے بولی۔ مجھ سے بات نہیں کرو گے۔

نہیں لاچی۔ خوب چند گھبرایا ہوا بولا۔ یہ بات نہیں ہے مجھے دھچکا سا لگا ہے۔۔۔۔

میں بہت بدصورت ہوگئی ہوں۔

لاچی نے خوب چند سے پوچھا۔

وہ اس سوال سے اور بھی گھبرا گیا۔

فوراً انکار کرتے ہوئے بولا۔ نہیں نہیں لاچی یہ بات نہیں ہے تم اس کرسی پہ بیٹھو۔ خوب چند نے ہاتھ کا سہارا دے کر لاچی کو کرسی پہ بٹھانا چاہا۔ لیکن لاچی نہیں بیٹھی۔ بولی۔ میں تمہاری قیدی ہوں شہری مان میں تمہارے سامنے کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔

ہسپتال میں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ خوب چند جلدی جلدی سے بولنے لگا۔ میں تمہیں خود دیکھنے کے لئے آنا چاہتا تھا۔ لیکن ادھر جیل میں کام یکلخت اتنا بڑھ گیا کہ مجھے پل بھر کے لئے بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ لیکن دل میں ہمیشہ یاد کرتا تھا۔ یہاں جیل میں ہر شخص تمہارے اعلیٰ اخلاق اچھے کردار اور بلند سیرت۔

شہری مان۔ لاچی نے خوب چند کی ان سطحی باتوں کو بیچ ہی سے کاٹ دیا۔ کیونکہ ان باتوں کا مطلب ہی کیا تھا۔

ہاں لاچی۔

مجھے پیرس لے چلو گے۔

پیرس۔ اوہ۔ پیرس۔ ہا ہا۔ خوب چند کھسیانی ہنسی ہنسا۔

ہاں۔ اور صرف میری تصویر بنایا کرو گے نا؟ کیونکہ کبھی کبھی ایک شخصیت ایک سمندر ہو جاتی ہے اور میں بھی تو ایک سمندر ہوں۔ کیا ہوا اگر مجھ میں تھوڑا سا کوڑا کرکٹ آن ملا ہے سمندر میں تو سینکڑوں ہزاروں من انسانی غلاظت دریاؤں کے ذریعے آکر گھل جاتی ہے۔ ہے نا۔

لاچی کی آواز میں شدید تلخی تھی۔

اے۔ اے۔ لاچی! سنو لاچی تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔

یکایک لاچی کا دل بیٹھنے لگا۔

گُل واپس آگیا ہے۔ ضرور گُل واپس آگیا ہے۔

لاچی کی آنکھیں کانپنے لگیں۔ اب وہ کھڑی نہ رہ سکی تھی۔ کرسی کے بازو کا سہارا لے کر لیا ایک دم بیٹھ گئی۔ اور بہت کمزور آواز میں بولی۔ گُل واپس آگیا ہے۔ اس کی چٹھی آئی ہے۔

نہیں۔ خوب چند نے میز کی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے کہا۔ اور یہ خوشخبری سُن کر جیسے لاچی کی رُکی ہوئی سانس کی آمد رفت پھر سے شروع ہو گئی۔ رگوں میں پھر خون دوڑنے لگا۔ اور وہ خوف اور وحشت جس نے گویا اس کے گلے کو پکڑ لیا تھا۔ آپ ہی آپ کہیں زائل ہو گئے۔

گورنمنٹ نے میری سفارش پر تمہارے اعلٰی چال چلن اور تمہارے جیل کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے تمہاری باقی سزا معاف کر دی ہے آج سے تم آزاد ہو۔ جہاں جا سکتی ہو۔

جہاں چاہے جا سکتی ہوں۔ یہ الفاظ تیر کی طرح لاچی کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ کبھی اس نے سوچا تھا جیل سے آزاد ہو کر وہ اپنے گُل کے ملک میں جائے گی۔ اور اسے ڈھونڈے گی پیدل پیدل چل کر۔ منزل منزل ٹھہر کر ایک دن وہ گوہر مقصود کو پالے گی۔ لیکن جب تو اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھیں جو کروڑوں انسانوں کے چہرے میں اپنے محبوب کا چہرہ تلاش کر سکتی تھیں۔ اب وہ وسیع۔ بے کنار تاریکی کی پہنائیوں میں کھو کر کس طرح اپنے گُل کو ڈھونڈ سکتی ہے۔ قدرت اس سے سب کچھ لے لیتی لیکن آنکھیں تو رہنے دیتی۔ آنکھیں جو محبوب کو دیکھنے کے لئے ہوتی ہے۔

اب تم کہاں جاؤ گی لاچی۔ خوب چند نے سوال کیا۔ اور لاچی کے خیال کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

لاچی نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اب تو کہاں جائے گی لاچی۔ یہ جیل کی چار دیواری جو چند ماہ کے لئے ایک بے کس اندھی کے لئے جائے پناہ ثابت ہوئی وہ بھی ان لوگوں نے تجھ سے چھین لی۔ اب تو کہاں جائے گی۔ جس کے لئے تو نے قبیلہ چھوڑا اور جس کے لئے قبیلے نے تجھے چھوڑ دیا وہ بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ پھر ڈھونڈ لے۔ یہ دُنیا تو بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں تجھے بھی سہارا مل جائے گا۔ خیال دوڑا لے چاروں طرف۔ کیا تیرا یہاں کوئی نہیں ہے۔

لاچی نے اپنے ذہن میں چاروں طرف خیال دوڑایا۔ لیکن وہ اندھی ہو چکی تھی کچھ نہ دیکھ

سکی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی ۔ مجھے جیل خانے کے باہر چھوڑ دو ۔ جہاں جانا ہوگا خود چلی جاؤں گی۔

خوب چند نے جلدی سے گھنٹی بجائی ۔ ایک ملازم اندر آیا ۔ خوب چند نے کہا۔ لاچی کو کالی چرن صاحب کے دفتر میں لے جاؤ ۔ وہ تمام ضروری کاغذات دیکھ کر اسے رہا کر دیں گے ۔

ملازم لاچی کو سہارا دے کر خوب چند کے دفتر سے باہر لے گیا ۔ خوب چند رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا ۔ دل ہی دل میں وہ خدا کا شکر بجا لایا ۔ زیادہ تلخ کلامی بھی نہیں ہوئی اور معاملہ آسانی سے حل ہو گیا ۔

کالی چرن کا دفتر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ جیل کی تین چار عورتیں جیناں بائی میسر چنڈالی حاجی عبدالسلام بھی موجود تھے ۔ اور حیرت ، تأسف ، ہمدردی اور استہزا کے ملے جلے جذبات سے لاچی کو دیکھ رہے تھے ۔ لیکن سب دم بخود اور خاموش تھے ۔ لاچی کی خوب صورتی نے جس طرح ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا تھا ۔ اس کی بدصورتی نے اسی طرح اُن کے جذبات کو یخ بستہ کر دیا ۔ اگر اس وقت وہ یہ سوچتے تھے کہ ایسی خوب صورتی ممکن نہیں ہے تو اس وقت ان کا خیال تھا کہ ایسی بدصورتی کیسے ممکن ہو سکتی ہے ۔

کالی چرن نے تمام ضروری کاغذات پر لاچی کا انگوٹھا لگوایا ۔ اب اس کی رہائی کا وقت آ گیا تھا۔ لاچی بولی ۔ حاجی جی یہاں ہیں ۔

ہاں موجود ہیں ۔ کالی چرن بولا ۔

اور میر چنڈالی ۔ وہ بھی ہیں ۔ کیوں

کالی چرن نے پوچھا ۔ لاچی نے کہا ۔ ایک بار ان لوگوں نے جیناں بائی کے ذریعے مجھے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ میری آبرو لینے کے عوض پچاس ہزار روپیہ دیں گے ۔ میں بدصورت ضرور ہو چکی ہوں ۔ لیکن میری آبرو سلامت ہے ۔ دفتر میں سناٹا چھا گیا ۔ لاچی نے اپنی اندھی آنکھیں جھپکائیں اور حاجی اور میر چنڈالی کی طرف مڑ کر بولی ۔

آج بولی ہو جائے ۔ آؤ آج لاچی کی آبرو کو نیلام کریں بولو حاجی ۔ بولو میر چنڈالی ۔ پچاس ہزار

دیکھنے والو آج پانچ روپے ایک ..... پانچ روپے ایک ..... پانچ روپے ..... ایں کیسا آج کوئی بھی بولی نہ دے گا۔

سب خاموش بیٹھے رہے۔

لاچی زور زور سے ہنسنے لگی۔ زہریلی ہنسی کا ایک ریلا سا تھا جس سے اس کا دُبلا پتلا مریل سا جسم لرز لرز جاتا تھا۔

سب خاموش رہے۔ کالی چرن نے اشارہ کیا۔ اور دو وارڈرن اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جیل سے باہر چھوڑ آئے۔

باہر کی دُنیا بھی اتنی تاریک تھی جتنی جیل کے اندر کی دُنیا۔ دراصل لاچی ابھی اپنے اندھے پن سے ابھی طرح مانوس نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ جیل سے باہر نکلی تو اس کی آنکھیں بے اختیار آسمان کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیلا آسمان دیکھے گی۔ روشن چمکدار دھوپ دیکھے گی سفید سفید بادلوں کو پاکیزہ آرزوؤں کی طرح لہلہاتے ہوئے دیکھے گی۔ اسے لوگ نظر آئیں گے۔ موٹریں۔ سڑک کے کھمبے خوبصورت ساڑیاں۔ دلکش بچے۔ رنگین غبارے اُڑاتے ہوئے۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے۔ خوشی کی دھومیں مچاتے ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے جیل سے باہر نکلتے ہوئے اس کے دل میں یہ تمام تصویریں آئی تھیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں جب اس نے آسمان کو تاریک دیکھا اور زمین سیاہ اور افق سے افق تک ایک گہری دبیز چادر تنی ہوئی نظر آئی تو اس کے صبر کے بند ٹوٹ گئے۔ اور وہ وہیں جیل کے باہر فٹ پاتھ پہ گر گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زمین کی مٹی اس کی آنکھوں میں تھی۔ اس کے ہونٹوں میں تھی اس کی اندھی آنکھوں میں عجز اور اس کے بے قرار دل کا لہو آنسوؤں کی صورت میں بہہ بہہ کر دھرتی میں جذب ہو رہا تھا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آنسو صرف آنسو ہے پانی نہیں ہے۔ پانی سے دھرتی میں چھپا ہوا بیج پھوٹ کر اُبھر آتا ہے لیکن آنسو سے دل کا غم بھی نہیں اُبھرتا۔ ورنہ آج اس سطح زمین پر جگہ جگہ غم کے پودے اُگ آتے۔ اور چیخ چیخ پر انسان کے ظلم کی دہائی دیتے۔

سترہواں باب

اسٹیشن یارڈ میں ہنگامہ تھا۔

رسک لال اپنی ڈھیلی پگڑی سنبھالتا ہوا ادھر سے اُدھر دوڑ رہا تھا۔ اسٹیشن سے آگے لائن خراب ہو چکی تھی۔ اس لئے فرنٹیر میل دلی سے آتے ہوئے اسی اسٹیشن پر چند گھنٹوں کے لئے رُکنے والی تھی۔ آج تک فرنٹیر میل ایسی عظیم الشان گاڑی کبھی اس اسٹیشن پر رُکی نہ تھی۔

رسک لال بہت خوش تھا۔ اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اور قلی۔ کانٹے والے۔ سگنل مین یارڈ مستری سب لوگوں کی شامت بلائے ہوئے تھا۔ ایسا معلوم تھا کہ فرنٹیر میل نہیں۔ گورنر صاحب اسٹیشن پر قیام کرنے کی غرض سے آرہے ہیں۔

اسٹیشن سے باہر مادھو فروٹ والا اور حمید ٹیکسی والوں کا سرغنہ بھی بے حد خوش تھے۔ آج گاہکی بڑھ گئی۔ اس لئے فروٹ اور ٹیکسی دونوں کے دام بھی بڑھ جائیں گے۔ پرائیویٹ ٹیکسیوں تک کا دھندا چمک جائے گا کیونکہ بہت سے لوگ اتنی دیر تک فرنٹیر میل کے رُکے رہنے کا انتظار نہ کریں گے۔ اور یہیں سے ٹیکسی لے کر اور بچوں کے لئے پھل خرید کر شہر کو چل دیں گے۔ مادھو لال جلدی جلدی سے پھلوں پر اپنا گندہ رومال گھس گھس کر اُن کو جوتوں کی طرح چمکا رہا تھا۔ ٹیکسی والوں نے اسٹیشن کے باہر ایک طرف لائن لگا لی تھی۔ دوسری طرف کنکر بجری اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر کے پاس سڑک کوٹنے والا انجن بھی بھاپ نکال رہا تھا۔ سڑک کی مرمت

کی جا رہی تھی ۔ پان والے کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں آج دونوں کی سرد بازاری کی کسر پوری ہو جائے گی ۔

فرنٹیر میل آ گئی ۔ اور چار نمبر کے پلیٹ فارم پر رُک بھی گئی ۔ لیکن ہنگامہ کچھ زیادہ نہیں ہوا ۔ اور مسافر بھی بڑی تعداد میں نہیں اُترے ۔ کیوں کہ گاڑی کے رُکتے ہی خبر آ گئی کہ آگے کا راستہ صاف ہو چکا ہے ۔ اس لئے گاڑی چند گھنٹے رُکنے کی بجائے صرف چند منٹ رُکے گی ۔ اس لئے جن مسافروں نے یہاں سے اُتر کر ٹیکسی لے کر شہر جانے کا پروگرام بنایا تھا انھوں نے جب پلیٹ فارم کے لاؤڈ اسپیکر سے یہ خوشگوار خبر سنی تو اُترنے کا ارادہ ملتوی کر کے گاڑی میں بیٹھے رہے ۔ اور قلی اور پان والے ۔ فروٹ والے ٹیکسی والے اور پرائیویٹ گاڑی والے سب کے سب نا اُمید ہو کر اپنا سا منھ لے کر رہ گئے ۔

دھت تیرے کی ! آج اپنا لک ہی خراب ہے ۔ حمید ا ٹیکسی والے نے ریل کی چھڑ پر پان کی پیک زور کی ڈالتے ہوئے کہا ۔

گاڑی سے چند ہی مسافر اُترے ۔ اُن میں سے ایک گل بھی تھا ۔ حمید نے اُسے دیکھتے ہی پہچان لیا ۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے بڑے زور سے مصافحہ کیا ۔

میں نے سمجھا تم پاکستان چلے گئے ہو ۔ بہت عرصے سے تمھیں نہیں دیکھا ۔

والد تو پاکستان چلے گئے ۔ مگر میں دہلی میں تھا ۔ اور اتنے عرصے سے یہی کوشش کر رہا تھا کہ یہاں کی شہریت مل جائے ۔

تو کیا ہوا ۔ کچھ کامیابی کی صورت نظر آئی ۔

ہاں ۔ گل نے خوش ہو کر کہا ۔ مجھے یہاں کی شہریت مل گئی ہے ۔

لاچی کا کیا حال ہے ۔

مجھے کیا معلوم ۔ گل بولا ۔ دہلی سے میں نے تین چار خط جیل کے پتے پر لکھے تھے کسی کا جواب نہیں آیا ۔ اب کل جیل جاؤں گا تو اس سے ملوں گا ۔

اب سزا ختم ہونے والی ہے نا۔ حمیدا نے پوچھا۔

ہاں۔ گل خوش ہو کر بولا۔ صرف چار ناوَ رہ گئے ہیں میرے حساب سے۔

دونوں باتیں کرتے کرتے ایرانی ریستوران کے قریب آ پہنچے تھے جس کا ایک دروازہ سٹیشن کے اندر تھا تو ایک کونٹر اسٹیشن کے باہر بھی تھا۔ جہاں سے اسٹیشن کے باہر کا تمام نظارہ دکھائی دیتا تھا۔

آؤ چائے پیو۔

گل نے حمیدا سے کہا۔

نہیں۔ میں ذرا باہر جاتا ہوں۔ شاید کوئی گاہک مل جائے۔

حمیدا نے سر ہلا دیا۔ اور باہر چلا گیا۔

گل نے ریستوران کے اندر بیٹھ کر چائے کا آرڈر دیا۔ اور اپنی شہریت کے کاغذات نکال کر ان کا غور سے مطالعہ کرنے لگا۔

اسٹیشن کے باہر سڑک پر ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اور لوگ باگ فرنٹیئر میل سے مایوس ہو کر اس دوسرے ہنگامے سے دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ بات بڑی معمولی تھی ایک اندھی بھکارن نے گالی خوشی سے قبول کرنے کے بجائے مسافر کی بانہہ پکڑ لی تھی اور اس کے منہ پر دو گھونسے لگا کر اسے زمین پر گرا دیا تھا۔ ایسا واقعہ آج تک کسی نے دیکھا۔ سُنا نہ تھا۔ اس لئے سب لوگ بھکارن کے خلاف ہو گئے تھے اور پھر بھکارن تھی بھی عجیب اس کا سارا چہرہ چیچک کے گہرے داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی صورت بے حد خوفناک ہو گئی تھی اور کپڑے میلے اور جگہ جگہ سے تار تار۔ وہ صورت شکل سے ایک ڈائن یا چڑیل سے کم نہ تھی۔

مالزادی پیسہ نہیں دیتے ہیں تو زبردستی کرتی ہے۔ گھونسا مارتی ہے۔

مگر تو نے مجھے گالی کیوں دی۔ لاچی زور سے چلائی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ کئی مہینوں سے اس نے ادھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ شہر کے دوسرے حصوں میں بھیک مانگ کر اپنی گزر

کرتی تھی۔ اس نے کبھی اس اسٹیشن کا رُخ نہیں کیا تھا۔ جہاں کبھی زمانہ میں اس کا قبیلہ رہتا تھا۔ جہاں اس کے محبوب کا بل تھا۔ جس کے اسٹیشن یارڈ کے چپے چپے پر اس کے حُسن و جمال کی داستانیں رقم تھیں۔ لیکن دل کو ہزار بار سمجھانے پر بھی وہ ادھر آنے سے نہ رُک سکی شاید اسے اپنے وطن کی مٹی بلا رہی تھی۔ ہاں یہی اسٹیشن یارڈ تو اس کا وطن تھا۔ شاید نہ آسودہ حسرتوں کی تمنا یا ماضی کے سپنے اُسے ادھر بلا لائے تھے۔ کچھ ہو آج وہ ادھر آ ہی گئی تھی۔ راستہ پُوچھتے پُوچھتے۔ پتھریلی بے رحم سڑکیں ٹٹولتے ٹٹولتے آج اپنے ماضی کی طرف پلٹ آئی تھی۔ شاید یہ دھرتی اسے پہچان جائے۔ شاید یہاں کسی بہتر سلوک کی آرزو جاگ جائے شاید! شاید ؟ اسی لئے اسے اتنا غصّہ آیا تھا۔ جب اسے مسافر نے گالی دی تھی۔ وہ اسٹیشن یارڈ کی ملکہ تھی۔ اس علاقے کی رانی۔ جہاں پر اس کے قدم پڑتے تھے وہاں پر اس علاقے کی مخلوق آنکھیں بچھاتی تھی۔ اس نے اس مسافر کو بتا دیا کہ وہ ابھی تک وہی لاچی ہے۔

اُس نے مسافر کی گالی سُن کر اسی وقت اس کا بازو پکڑ کر دو طمانچے رسید کر دیئے تھے۔ غم اور غصّے سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پھر کسی نے اس کی چھڑی اس کے ہاتھ سے چھین لی اور ایک زور کا تھپڑ مار کر بولا۔

حرامزادی ! ایک تو بھیک مانگتی ہے اُوپر سے شریف آدمیوں پر ہاتھ اُٹھاتی ہے۔

لاچی نے آواز پہچان لی۔ یہ حمیدا ٹیکسی والا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ پھر غم اور غصّے کا جدید ایک سیلاب کی طرح اُمڈ آیا۔ وہ بپھر کر بولی۔ اندھی جان کے میری بے عزتی کرتا ہے۔ میرے نزدیک تو آ تیری ہڈی پسلی ایک کر دوں گی۔ جانتا ہے میں کون ہوں۔ لاچی زور سے چلائی۔

شیطان کی خالہ۔ بدذات چڑیل ہے۔ قبرستان کی ڈائن ہے اور کون ہے تو ..... بہت آتی ہیں تجھ جیسی یہاں اڈے پر بھیک مانگنے والیاں۔

حمیدا نے غصّے سے کہا۔

پھر اس نے لاچی کی چھڑی سے ایک اور بھرپور وار اس کی پیٹھ پر کیا۔ لاچی تڑپی۔

تلملائی ۔ چکرائی اس کے بازو جیسا کو ٹٹولتے ہوئے چاروں طرف بڑی بے بسی سے گھومنے ۔ اس کی ان حرکات کو دیکھ کر سکول سے آتے ہوئے بچے ہنسنے لگے ۔ چند بچوں نے سڑک پر پڑے ہوئے پتھروں کے ڈھیر سے پتھر اٹھا لئے ۔ اور اندھی کو مارنے لگے ۔ مارو ! مارو !! چند لڑکے خوشی سے چلائے ۔

وہ مسافر جیسے لاچی نے گھونسا مار کے گرایا تھا ۔ اس نے بھی ایک پتھر مارا ۔ لاچی کے ماتھے سے خون نکل آیا ۔ وہ لڑکھڑا کر بھاگنے لگی ۔ لوگوں کے مجمع نے اسے دوسری طرف دھکیل دیا ۔ مادھو پھل والے نے پتھر مار کے غصے سے کہا ۔

مارو ۔ مارو ۔ پتھر لاچی کے شانے پر جا لگا ۔ لاچی نے مادھو کی آواز پہچان لی ۔ دل ہی دل میں بولی ۔ یہ مادھو ہے ۔ مارو ۔ مارو ۔ سالی کو ! پان والے نے پتھر اٹھایا ۔ یہ سکھیا پان والا ہے ۔ لاچی نے اپنے دل میں کہا ۔

لاچی اب زمین پر گر گئی تھی ۔ اور اس کے چاروں طرف سے پتھروں کی بارش ہو رہی تھی ۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا تھا ۔ اور زمین کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی ۔ اور پتھر اس کے جسم کو چھلنی کر رہے تھے ۔ یکایک مجمع چھٹتا ہوا معلوم ہوا ۔ لوگ تتر بتر ہو کر بھاگ گئے ۔ پولیس والوں کے قدموں کی آواز قریب آتی گئی ۔ پھر کسی نے دونوں بازوؤں سے اسے اٹھا لیا ۔ اور اسے لے کر ایرانی ریستوران کی طرف دوڑا ۔ دو میزیں جوڑ کر اسے لٹا دیا ۔ اور کسی نے بھاری آواز میں کہا ۔

پانی لاؤ ۔ پانی لاؤ ۔

یکایک لاچی چونکی ۔ یہ گل کی آواز تھی ۔ جو اس کے رگ و ریشے میں سمائی جا رہی تھی یہ گل کے ہاتھ تھے جو اس کے چہرے کے زخموں کو دھو رہے تھے ۔ یہ ابر رحمت کے قطرے تھے جو اس کی اندھی آنکھوں کو ایک نور بینائی بخش رہے تھے ۔ یہ تو میرا گل ہے یہ تو میرا گل ہے ۔

کیا ہوا۔ ایک پولیس والے نے گل سے پوچھا۔

مجھے خود معلوم نہیں۔ میں یہاں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ شور سن کر باہر گیا تو دیکھا لوگ اس کے پتھر مار رہے تھے میں اسے اٹھا کر ان لوگوں کے نرغے سے نکال کر یہاں لے آیا۔

اچھا کیا۔

جب یہ ہوش میں آجائے گی تو تم اس بے چاری کی رپورٹ ضرور درج کر لینا۔ سنتری جی!

سنتری زور سے ہنسا۔ اگر ایسے بھکاریوں کی رپورٹ درج کرتے پھریں تو شہر کی پولیس کچھ اور کام ہی نہ کر سکے! وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

[illegible] کے پاس فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ گل نے جلدی جلدی کسی طرح ان زخموں کی مرہم پٹی کی۔ لیکن پھر بھی اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ضروری تھا۔ اور ڈاکٹر کی دکان اسٹیشن سے باہر پان والے کی دکان کے برابر واقع تھی۔ گل نے اس سے پوچھا۔ کیا تو چل سکتی ہے۔

لاچی نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔ یہ بالکل سچ تھا۔ وہ اپنے اندر ذرا بھی طاقت محسوس نہ کرتی تھی۔ شاید وہ زخموں سے نڈھال ہو کر بھی وہاں سے چلی جاتی۔ لیکن گل کی آمد نے اس کی روح اور جسم کی ساری طاقت سلب کر لی تھی گل نے اسے بازوؤں سے اٹھا لیا۔ اور ایرانی سے بولا۔

میں اسے ڈاکٹر کی دکان تک لے جاتا ہوں۔

لاچی نے جب سر گل کے کندھے پر محسوس کیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا رونا تو اسے آج تک نہ آیا تھا۔ ہر محرومی۔ ہر یاس۔ ہر حسرت ہر یاد دل کی گہرائیوں سے ایک جھرنے کی طرح پھوٹ نکلی تھی۔

کاش انہی بازوؤں میں اس وقت اس کا دم نکل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ تاریک رات کا سفر اگر اپنے محبوب کے بازوؤں میں کٹ جائے تو موت کتنی دلکش ہو جائے۔ اے میرے مالک خدا! میں تجھ سے اور کچھ نہیں مانگتی۔ بس اس طرح میری جان لے لے۔ مجھے اس کندھے پر ہمیشہ کے لئے سو جانے دو۔

گل نے ڈاکٹر کی دکان کے اندر جا کر اسے سہارا دے کر بینچ پر بٹھا دیا۔ ڈاکٹر نے زخموں کا معائنہ کیا۔ زخم دیکھ کر کہا۔

زخم معمولی ہیں گہرے نہیں ہیں۔ ہفتے بھر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ روز پٹی کے لئے آنا پڑے گا۔

اس کا نام۔ گل لاچی کی طرف مڑا۔ پوچھنے لگا۔ تمہارا نام۔

لاچی خاموش رہی۔ خاموشی رہی۔ دل کا طوفان بڑھتا گیا.... بڑھتا گیا۔ قیامت کے شور سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ یہ گل کی آواز تھی کہ صور اسرافیل تھا۔ تمہارا نام! تمہارا نام! جیسے زمین اور آسمان کے دہانوں سے آتش فشاں لاوا پھٹ پڑا ہو۔ اور رعد کی آواز سے گرجتا ہوا لاچی کے چاروں طرف گھوم رہا ہو۔

ڈاکٹر صاحب تمہارا نام پوچھتے ہیں۔ گل نے پھر بڑی ملائمت سے کہا۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔

آج لاچی نے بڑی مشکل سے کہا۔

سچ کہتی ہے۔ ڈاکٹر نے جلدی جلدی سے پیڈ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ سڑک پر بھیک مانگنے والی ان اندھی بھکارنوں کا بھلا کیا نام ہوتا ہوگا۔

ایسا نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ گل نے مسکرا کر کہا۔

ان اندھی بھکارنوں کے بھی نام ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے اڈے بھی ہوتے ہیں جہاں یہ روز رات کو پہنچ جاتی ہیں۔ تم سچ کہتے ہو۔ لاچی نے اپنے دل سے کہا۔ کبھی میرا بھی ایک نام تھا۔ اور کبھی میرا بھی ایک گھر تھا۔ جہاں میں ہر روز اپنے خیالوں میں پہنچ جاتی تھی۔ رات کو بھی اور دن کو بھی۔ صبح کو بھی اور شام کو بھی۔ لیکن آج میرے خیالوں میں وہ رات آئی ہے جس کی کوئی صبح نہیں ہے۔ اب میں کہاں پہنچوں گی۔ اور کس کو آواز دوں گی۔ اور کس کو اپنا نام بتاؤں گی اور کس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گی۔ ڈاکٹر! ڈاکٹر کیوں اس نشتر سے میرے زخم کریدتے ہو۔ اسے

میرے دل میں، چبھو دونا ۔ تاکہ زندگی کی ساری جلن ایک ہی لمحے میں ختم ہو جائے ۔ ڈاکٹر نے پیڈ سے ورق پھاڑ کر گل کے ہاتھ میں تھما دیا ۔ پانچ روپے اور اگر اگلے سات دن پٹی کرو گے تو سات روپے اور ہوں گے ۔

گل نے جیب سے بارہ روپے نکال کے ڈاکٹر کو دیئے ۔ بولا یہ سات روپے کہاں سے لائے گی ۔ یہ بھی میں ہی دیئے دیتا ہوں ۔ پھر وہ لاچی کی طرف مڑ کر بولا ۔

روز پٹی کرانے آجایا کرو ۔

بہت اچھا ۔

لاچی بہت مدھم آواز میں بولی ۔

گل لاچی کو سہارا دے کر دکان سے باہر لایا ۔

باہر لا کے بولا ۔

کہو تو میں تمہیں تمہارے اڈے پر پہنچا دوں ۔

نہیں میں خود ہی چلی جاؤں گی ۔

گل چپ رہا ۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا ۔ تمہارا اڈہ کہاں ہے ۔

میرا اڈہ ۔ لاچی بولی ۔ جہاں رات پڑ گئی وہیں اڈہ ہے بابو ۔ تم نے بہت کر دیا ۔ اب تم جاؤ بابو ۔ اپنے گھر جاؤ ۔

یکایک لاچی کا گلا بھر آیا ۔ گل اس کی طرف دیکھتا رہا ۔ پھر آہستہ سے مڑا اور سر جھکا کر چلنے لگا ۔

وہ جا رہا ہے ۔ وہ جا رہا ہے وہ جا رہا ہے ۔ وہ اب تجھے کبھی نہیں ملے گا ۔ تو اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی ۔ کبھی چھو نہیں سکے گی ۔ اس کی یاد میں جلکہ جلکہ کر مر جائے گی اور اسے کچھ معلوم نہ ہوگا ۔ یکایک لاچی لڑکھڑاتی ہوئی گل کے قدموں کی آواز کی طرف دوڑی ۔ اس نے اپنی دونوں بانہوں سے گل کو پکڑ کر کہا ۔ اور اس کے سینے سے اپنے چہرے کو چھپاتی ہوئی بولی ۔

گل ۔ ! گل ۔!! گل !!! ـــــ مجھے پہچانتے نہیں ہو میں لاچی ہوں ـــ !

اٹھارہواں باب

ملن کی رات آئی تھی۔ مگر کس کے لئے کتنی مہیب اور خوفناک۔ ڈر، اور وحشت سے معمور اور کسی کے لئے کیسی چمکدار اور درخشندہ۔ کائنات کی ساری خوشبوؤں سے بھرپور ایک ہی رات تھی۔ مگر دونوں کے لئے کتنی مختلف تھی۔ لاچی اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھر کر گل کے سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ اور گل سوچ رہا تھا۔ یہ ایک رات میں دو راتیں کیسے ممکن ہیں۔ ایک تاریک اور سیاہ، گہری اور اتھاہ۔ بدہیبت اور بدبودار۔ غلاظت اور نجاست سے معمور۔ اور دوسری رات ستھرے ستھرے جذبات والی۔ معصوم اور پاکیزہ رات جب کہکشاں مسکراتی ہے اور چاندنی سیل رواں بن کر بہتی ہے اور افق سے افق تک کسی کے ذہن میں ستاروں کے پھول کھل جاتے ہیں۔ اور محبت کی آغوش وا ہو جاتی ہے اور کوئی اطمینان کی گہری ٹھنڈی سانس لے کر اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ ہاں ایک رات اور دوسری رات میں اتنا ہی فرق ہے جتنا نیکی اور بدی میں۔

لاچی گہری نیند سو رہی تھی۔ نیند میں اس کا چہرہ گوند والی ٹیپ کی صلیبوں سے پٹا ہوا چہرہ ایک مہیب قبرستان معلوم ہو رہا تھا۔ گل آہستہ سے بستر سے اٹھا۔ اور باہر بالکونی میں آگیا۔ رات خاموش تھی اور سیاہ۔ نہ چاند تھا نہ تارے۔ سیاہ بادلوں نے سارے آسمان کو اپنے تاریک غلاف میں ڈھانپ لیا تھا۔ گل نے آسمان کی طرف دیکھا۔ مگر وہ آسمان سے

کسی طرح کی مدد کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

گل نے مایوس ہو کر اپنے دل کو ٹٹولا۔ اسے جذبے سے خالی پایا۔ محبت کی ساری ریت بہہ گئی تھی اور اس کے دل کی مٹھی بالکل خالی ہو گئی تھی۔ وہ لاکھ اپنے دل کو سمجھاتا۔ مگر جب لاچی کی طرف دیکھتا۔ اسے ایک کراہیت آمیز متلی کا احساس ہونے لگتا۔ یہ وہ لاچی نہیں ہے جس سے اس نے محبت کی تھی۔ جس کی خاطر اس نے ساری دنیا سے لڑائی مول لی تھی۔ جس کے لیے اس نے ملک اور کلچر۔ تہذیب اور عقل و دانش کی ساری دیواریں پھلانگ لی تھیں۔ وہ لاچی۔ جو آج اس کی آغوش میں تھی وہ اس سے پیار نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے بازوؤں میں لپٹا نہیں سکتا تھا۔ اس کا وہ اعلیٰ وارفع دجگر کو گرمانے والا سانس روکنے والا شدید جذبہ آج کہاں غائب ہو گیا تھا۔ چاروں طرف برف تھی۔ برف ہی برف۔ جس جذبے کو ٹٹولو یخ بستہ۔ جس آرزو کو دیکھو برفیلی۔ جس شوق کو چھوؤ خاکستر۔ حالاں کہ یہ وہی لاچی تھی۔ وہی اس کا بلند جذبہ تھا۔ وہی مکمل سپردگی اور اعتماد۔ اسے سب کچھ مل گیا گویا دنیا کی تمام خوشیاں اسے حاصل ہو گئی تھیں۔

لیکن وہ خود ایک لق و دق صحرا میں اکیلا کھڑا تھا۔ اور چاروں طرف گھوم گھوم کر اپنے جذبے کو آواز دیتا تھا۔ لیکن کہیں سے پلٹ کر محبت کا کوئی بھی جذبہ اس کو پکارتا نہ تھا۔

رات تاریکی تھی۔ چاند جامد۔ مایوسی مکمل!

گل نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے بال نوچ لیے۔ لیکن وہ کسی طرح بھی کسی لطیف جذبے کو اپنے پاس نہ بلا سکا۔

ڈاکٹر نے سات دن کے بعد لاچی کی پٹیاں کھول دیں۔ دس دن کے بعد لاچی چلنے پھرنے لگی تو لاچی سے گل نے کہا۔ مجھے پونا میں ایک نوکری مل گئی ہے۔ مجھے وہاں جانا ہو گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لاچی خوش ہو کر بولی وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں پہلے جا کر حاضری دے آؤں ایک مکان تمہارے لیے ڈھونڈ لوں آخر ایک چھوٹا سا گھر تو بسانا ہی ہو گا۔

ہائے میرا گھر۔ لاچی خوشی سے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بولی۔

کتنے دن لگ جائیں گے۔

تقریباً ایک ماہ لگ جائے گا۔

اور ایک ماہ میں یہاں اکیلی رہوں گی۔ لاچی نے گھبرا کے پوچھا نہیں میں تمہارے بغیر اتنے دن کیسے رہ سکوں گی۔

بس ایک ماہ کی تو بات ہے۔ ایک ماہ کے بعد میں بمبئی سے آکر لے جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے اس سے پہلے ہی لے جاؤں۔ لینے کو تو ابھی ساتھ لیتا جاؤں۔ مگر تمہیں رکھوں گا کہاں۔ یہاں تو والد کے گھر میرے قبضے میں چھوڑ گئے ہیں۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے میں لوگوں سے کہہ جاؤں گا۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف بھی نہ ہو گی خط بھی ہر ہفتے لکھتا رہوں گا۔

لاچی راضی ہو گئی۔ گل سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ چلتے وقت اسے پچاس روپے دے گیا اُوپر کے خرچ کے لئے۔ لاچی بہت خوش تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دوسرا ہفتہ گزر گیا۔ تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ مگر گل کا خط نہ آیا۔ ڈاکیہ آتا تھا اور لاچی کے کمرے کے سامنے سے گزر جاتا۔ لاچی ہر روز ڈاکئے سے پوچھتی تھی اور ڈاکیہ ہر روز انکار میں جواب دیتا تھا۔ پھر بھی لاچی ہر روز پوچھتی تھی۔

اس طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔

پھر اس طرح دوسرا ہفتہ گزر گیا۔

نہ گل آیا نہ اس کا خط آیا۔

لاچی نے پچاس روپے بے حد سنبھال سنبھال کر خرچ کئے تھے۔ لیکن آخر پچاس روپے ہی تو تھے۔ دو مہینوں میں ختم ہو گئے۔ چار چھ دن اُدھار سے کام چلا پھر لوگوں نے اُدھار دینا بند کر دیا۔ اب تین روز سے لاچی کے ہاں فاقہ تھا۔ لوگ مُسکراتے تھے۔ من چلے اس پر آوازیں کستے تھے۔ اندھی۔ بے وقوف! گل کا انتظار کر رہی ہے۔ جی ہاں۔ وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ بھلا اسے اس اندھی سے زیادہ خوب صورت لڑکی اس جہاں میں کہاں ملے گی۔

لاچی سب کچھ سنتی لیکن خاموش رہتی اُسے اپنے گل پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے دل میں تاریک سے تاریک وسوسے اُٹھتے تھے۔ پھر بھی وہ اپنی روح کی گہرائیوں سے گل کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اور پورے اعتماد سے اپنے دل کو سمجھاتی۔ گل آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ ضرور کوئی بات ہو گئی ہے۔ وہ بیمار پڑ گیا ہے۔ یا اسے نوکری نہیں ملی۔ مگر اس کو چاہئے تھا کہ مجھے خط تو لکھتا۔ دو سطروں کا خط لکھ دیتا۔ بس یہ خاموشی اچھی نہیں۔ ٹھیک دو ماہ دس روز کے بعد ڈاکیے کے قدم لاچی کے کمرے کے سامنے آکر رک گئے۔

اب چند دنوں سے لاچی نے پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ اور خلاء میں گھورتی رہتی تھی۔ ڈاکیے نے بلند آواز میں کہا۔ لاچی! تمہارا منی آرڈر ہے۔ ایک لمحے کے لئے تو لاچی کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔ دوسرے لمحے وہ دوڑتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اور ڈاکیے سے ٹکراتی ٹکراتی بچی۔

گل کا منی آرڈر ہے۔

ہاں!

کہاں سے آیا ہے

پونا سے

کتنے کا منی آرڈر ہے

تیس روپے کا۔

اور کیا لکھا ہے

لکھا ہے ابھی مکان نہیں ملا۔ جب ملے گا آکر لے جاؤں گا۔

یکا یک لاچی نے ڈاکیے سے کہا کہ منی آرڈر واپس کر دو۔ منی آرڈر واپس کر دو۔ لاچی کمرے کے اندر گئی اور چھڑی اُٹھائی اور سڑک پر بھیک مانگنے کے لئے چلی گئی۔



اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی لاچی دھیرے دھیرے غم کے بار سے سسکنے لگی۔ لاچی ایسی عجیب لڑکی تھی کہ جس ماحول میں رہتی تھی اس سے الگ سوچتی تھی۔ لاچی ایسی خوبصورت لڑکی تھی اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو سیب کا پیڑ ہوتی۔ ہمالہ کی کنواری برف میں ڈھکی ہوئی چوٹی ہوتی۔ یا زیرِ آب سمندر کی ریف میں مستور کورل کا گلابی محل ہوتی۔ لیکن قدرت نے اسے عورت بنایا تھا اور ماحول اور اتفاق نے اسے خانہ بدوش بنا دیا تھا۔ اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ کبھی انسان سے انصاف نہیں کرتیں۔ قدرت، ماحول، اتفاق ان تینوں چیزوں کے زبردست ہاتھوں سے انصاف کو چھیننا پڑتا ہے۔



ASIA PUBLISHERS